شعبان ۱۴۳۱ھ، بمطابق اگست ۲۰۱۰ء
شمارہ نمبر ۲۲

بشریتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام

دوسری قسط غلام مصطفیٰ ظہیرامن پوری

اہل سنت والجماعت کا یہ اجماعی واتفاقی مسئلہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ بشر تھے، اس عقیدہ پر قرآنی وحدیثی دلائل ملاحظہ ہوں۔

دلیل نمبر①: فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُونِ اللّٰهِ﴾(آل عمران : ٧٩)

''کسی بشر کے لیے یہ لائق نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو کتاب وحکمت اور نبوت دے، پھر وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کو چھوڑ کر میری بندگی کرو۔''

دلیل نمبر ② : سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **اللّٰهم إنّما أنا بشر فأيّما رجل من المسلمين سببته ، أو لعنته ، أو جلدتّه ، فاجعلها له زكاة ورحمة .** ''اے اللہ! یقیناً میں ایک بشر ہوں۔ مسلمانوں میں سے جس کو میں نے برا بھلا کہا ہے یا اس پر لعنت کی ہے یا اس کو کوڑے مارے ہیں، تُو ان چیزوں کواس کے لیے پاکیزگی کا ذریعہ اور رحمت بنا دے۔''

(صحيح مسلم : ٣٢٤/٢، ح : ٢٦٠١)

دلیل نمبر ② : سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **إنّما أنا بشر ، ولعلّ بعضكم يكون ألحن بحجّته من بعض ، فمن قضيت له من حقّ أخيه شيئا ، فإنّما أقطع له قطعة من النار .**

''بلاشبہ میں ایک بشر ہوں۔ شاید کہ تم میں سے کوئی اپنی دلیل کو بیان کرنے میں دوسرے سے زیادہ تیز زبان ہو، چنانچہ جس کے لیے میں اس کے بھائی کے حق میں سے کسی چیز کا فیصلہ

کردوں، میں اسے آگ کا ایک ٹکڑا کاٹ کر دے رہا ہوں۔''

(مصنف ابن ابی شیبة : ۲۳٤/۷، مسند الامام احمد : ۲ /۲۳۲، سنن ابن ماجه : ۲۳۱۸، مسند ابی یعلی : ۵۹۲۰، وسندهٗ حسنٌ)

اس حدیث کو امام ابنِ حبان رحمہ اللہ (۵۰۷۱) نے ''صحیح'' کہا ہے۔

بوصیری کہتے ہیں: **هذا إسناد صحيح .** ''یہ سند صحیح ہے۔''

(مصباح الزجاجة للبوصیری : ح :۸۲۰)

(ا) امام ابن عبدالبر رحمہ اللہ (۳٦۸۔٤٦۳ھ) اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

وفی هذا الحديث من الفقه أنّ البشر لا يعلمون ما غيب عنهم ، وستر من الضّمائر وغيرها ، لأنّه قال صلّى الله عليه وسلّم فی هذا الحديث : ((إنّما أنا بشر)) ، أی إنّی من البشر ، ولا أدری باطن ما تتحاكمون فيه عندی وتختصمون فيه إلیّ ، وإنّما أقضی بينكم علی ظاهر ما تقولون وتدلون به من الحجاج ، فإذا كان الأنبياء لا يعلمون ذلک فغير جائز أن يصحّ دعوی ذلک لأحد غيرهم من كاهن أو منجّم ، وإنّما يعلم الأنبياء من الغيب ما أعلموا به بوجه من وجوه الوحی . ''اس حدیث میں یہ فقہ ہے کہ بشر غیب چیزوں اور مستور حقائق کو نہیں جانتے ، کیونکہ آپ ﷺ نے اس حدیث میں یہ فرمایا ہے کہ میں جنس بشر میں سے ہوں ، میں ان تمہارے جھگڑوں کی باطنی صورتِ حال کو نہیں جانتا ، بلکہ میں تو تمہاری ظاہری بات چیت اور گفتگو کے مطابق فیصلہ کرتا ہوں ۔ جب انبیائے کرام غیب نہیں جانتے تو کسی اور انسان مثلاً کاہن ، نجومی ، وغیرہ کی طرف سے یہ غیب جاننے کا دعویٰ قطعاً درست نہیں ہوسکتا؟ انبیائے کرام صرف وہی غیب جانتے ہیں ، جس کی ان کو وحی کے کسی طریقے کے ساتھ خبر دے دی گئی ہو۔۔۔''(التمهيد لما فی الموطا من المعانی والاسانيد : ۲۱۲/۲۲)

(ب) علامہ قرطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **قوله صلّى الله عليه وسلّم :**

((إنّما أنا بشر)) تنبيه على أنّ أصل البشريّة عدم العلم بالغيب، وبما يخفى من البواطن إلّا من أطلعه اللّٰه تعالیٰ علی شیء من ذلک. ''نبیٔ اکرم ﷺ کا فرمان کہ میں بشر ہوں، اس بات پر تنبیہ ہے کہ بشریت میں اصل یہ ہے کہ بشر کو غیب اور باطن میں مخفی باتوں کا علم نہیں ہوتا، سوائے ان لوگوں کے، جن کو اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی چیز پر اطلاع دے دے۔۔۔'' (المفہم للقرطبی: ۷۱/۱۶، المکتبة الشاملة)

(ج) حافظ نووی رحمہ اللہ (۶۳۱۔۶۷۶ھ) اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

وقوله صلّی اللّٰه علیه وسلّم: ((إنّما أنا بشر))، معناه التنبیه علی حالة البشریّة، وأنّ البشر لا یعلمون الغیب وبواطن الأمور شیئا إلّا أن یطلعهم اللّٰه تعالیٰ علی شیء من ذلک. ''نبیٔ اکرم ﷺ کا فرمان کہ میں بشر ہوں، اس سے مراد بشریت کی حالت پر تنبیہ کرنا ہے کہ بشر غیب اور امور کے باطن میں سے کچھ بھی نہیں جانتے، سوائے اس صورت کے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس میں سے کسی چیز پر مطلع کر دے۔''

(شرح صحیح مسلم للنووی: ۷۴/۲)

(د) علامہ عینی حنفی (۷۶۲۔۸۵۵ھ) اس حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں:

قوله: ((إنّما أنا بشر)) علی معنی الإقرار علی نفسه بصفة البشریّة من أنّه لا یعلم من الغیب إلّا ما علّمه اللّٰه منه. ''آپ ﷺ کا یہ فرمان کہ میں بشر ہوں، اس بات کا اقرار ہے کہ آپ صفتِ بشریت سے متصف ہیں اور بشر کچھ بھی غیب نہیں جانتے، سوائے اس کے جو اللہ تعالیٰ ان کو بتا دے۔۔۔'' (عمدة القاری للعینی: ۲۴۷/۲۴)

نیز لکھتے ہیں: قوله: ((إنّما أنا بشر))، البشر یطلق علی الجماعة والواحد، یعنی أنّه منهم، والمراد أنّه مشارک للبشر فی أصل الخلقة، ولو زاد علیهم بالمزایا التی اختصّ بها فی ذاته وصفاته، وقد ذکرت فی شرح معانی الآثار، وفی قوله إنّما أنا بشر، أی من البشر، ولا أدری باطن ما

يتحاكمون فيه عندى ويختصمون فيه لدىّ ، وإنّما أقضى بينكم على ظاهر ما تقولون ، فإذا كان الأنبياء عليهم السلام لا يعلمون ذلک ، فغير جائز أن تصحّ دعوة غيرهم من كاهن أو منجّم العلم وإنّما يعلم الأنبياء من الغيب ما أعلموا به بوجه من الوحى . ''فرمانِ نبوی کہ میں بشر ہوں، بشر کا لفظ جماعت اور واحد دونوں پر بولا جاتا ہے، مراد یہ ہے کہ آپ ﷺ جنس بشر میں سے ایک فرد ہیں، یعنی آپ اصل تخلیق میں بشر کے ساتھ مشترک ہیں، اگرچہ ذات وصفات میں بہت سے خصائص کی وجہ سے آپ ﷺ عام انسانوں سے بڑھ کر ہیں، یہ خصائص شرح معانی الآثار میں مذکور ہیں۔ آپ ﷺ کا یہ فرمان کہ میں بشر ہوں، اس کا مفہوم یہ ہے کہ میں بشر میں سے ہوں اور میں تمہارے جھگڑوں کی اصل باطنی حقیقت نہیں جانتا، جن کے بارے میں تم میرے پاس فیصلے کے لیے آتے ہو، میں تو تمہارے ظاہری اقوال کے مطابق تمہارے درمیان فیصلہ کر دیتا ہوں۔

جب انبیائے کرام غیب نہیں جانتے تو کسی کاہن، نجومی وغیرہ کی طرف سے یہ دعویٰ درست ہونا ممکن نہیں۔ انبیائے کرام غیب میں سے صرف وہی چیزیں جانتے ہیں، جن کی انہیں وحی کی کسی قسم کے ذریعے خبر دے دی گئی ہو۔۔'' (عمدة القاری للعینی : تحت حدیث ۷۱۸۱)

(۶) علامہ عبدالرؤف المناوی رحمہ اللہ (۹۵۲۔۱۰۳۱ھ) لکھتے ہیں:

((إنّما أنا بشر)) ، أى مقصور على الوصف بالبشريّة بالنسبة إلى عدم الاطّلاع على بواطن الخصوم ، ((وإنّكم تختصمون إلىّ)) ، فيما بينكم ، ثمّ تردّونه إلىّ ، ولا أعلم باطن الأمر . ''میں بشر ہوں کا مطلب یہ ہے کہ جھگڑوں کی اصل حقیقت جاننے میں مَیں وصف بشریت پر مقصور ہوں، تم آپس میں جھگڑتے ہو، پھر اپنے جھگڑے میرے پاس لاتے ہو اور میں معاملے کے باطن کو نہیں جانتا۔۔''

(التیسیر بشرح الجامع الصغیر : ۷۲۹۸)

دلیل نمبر ③ : سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

کان رسول الله صلّى الله عليه وسلّم يطوف في النخل بالمدينة ، فجعل الناس يقولون : فيها صاع وفيها وسق ، فقال رسول الله صلّى الله عليه وسلّم فيها كذا وكذا ، قالوا صدق الله ورسوله ، فقال رسول الله صلّى الله عليه وسلّم : إنّما أنا بشر فما حدّثتكم عن الله ، فهو حقّ ، وما قلت فيه من قبل نفسي ، فإنّما أنا بشر أصيب وأخطيء . ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھجور کے باغ میں چکر لگا رہے تھے۔ لوگ کہنے لگے کہ اس کھجور پر ایک صاع کھجوریں ہیں اور اس پر ایک وسق کھجوریں ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اس میں اتنی کھجوریں ہیں۔ وہ لوگ کہنے لگے، اللہ اور اس کے رسول نے بالکل سچ فرمایا ہے۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یقیناً میں ایک بشر ہوں۔ جو چیز میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بتاؤں، وہ حق ہوتی ہے اور جو میں اپنی طرف سے کہوں تو میں بشر ہوں، غلطی بھی کرتا ہوں اور درستی کو بھی پہنچتا ہوں۔'' (مسند البزار : ٤٧٢٦، وسندهٗ حسنٌ)

(ا) امام بزار رحمہ اللہ کے استاذ اسماعیل بن عبداللہ الاصبہانی ثقہ، حافظ، ثبت ہیں۔

(دیکھیں سیر اعلام النبلاء للذہبی : ۱۳/۱۰۔۱۱)

(ب) اس کا راوی جعفر بن ابی المغیرہ جمہور کے نزدیک ''حسن الحدیث'' ہے۔ اس کی سعید بن جبیر سے روایت کو امام ترمذی رحمہ اللہ (۲۹۸۰) نے ''حسن''، امام ابنِ حبان (۴۲۰۲)، امام حاکم (۲/۴۵۳)، امام ضیاء المقدسی (المختارۃ : ۴/۴۸۴) اور حافظ ذہبی وغیرہم رحمہم اللہ نے ''صحیح'' کہا ہے، لہٰذا امام ابنِ مندہ کی بات بالفرض ثابت بھی ہو جائے تو اس کا جمہور کے مقابلہ میں کوئی اعتبار نہ ہوگا۔

دلیل نمبر ④ : سیدنا زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا: **أمّا بعد ، ألا أيّها النّاس ! فإنّما أنا بشر ،**

يوشک أن يأتي رسول ربّي ، فأجيب . ''امابعد،اے لوگو!خبردار،یقیناً میں ایک بشر ہوں،قریب ہے کہ میرے پاس میرے رب کا ایلچی (موت کا فرشتہ) آجائے اور میں اس کی دعوت کو (موت) قبول کرلوں۔''(صحيح مسلم : ٢٧٩/٢، ح : ٢٤٠٨)

دلیل نمبر ⑤ : سیدنا محمود بن لبید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

انكسفت الشمس يوم مات إبراهيم ابن رسول الله صلّى الله عليه و سلّم ، فقال الناس : انكسفت الشمس لموت إبراهيم ، فخرج رسول الله صلّى الله عليه وسلّم حين سمع ذلک ، فحمد الله وأثنى عليه ، ثمّ قال : أمّا بعد ، أيّها الناس ! إنّ الشمس والقمر آيتان من آيات الله ، لا ينكسفان لموت أحد ولا لحياة أحد ، فإذا رأيتم ذلک فافزعوا إلى المساجد ، ودمعت عيناه ، فقالوا : يا رسول الله ! تبكي وأنت رسول الله ؟ قال : إنّما أنا بشر ، تدمع العين ويخشع القلب ولا نقول ما يسخط الربّ ، والله يا إبراهيم ! إنّا بک لمحزونون ، ومات وهو ابن ثمانية عشر شهرا ، وقال : إنّ له مرضعا في الجنة .

''جس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لختِ جگر ابراہیم فوت ہوئے ، اس دن سورج گرہن زدہ ہوگیا،لوگوں نے یہ کہنا شروع کردیا کہ سورج ابراہیم کی موت کی وجہ سے گرہن زدہ ہوا ہے۔جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سنا تو باہر تشریف لائے ،اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی ، پھر فرمایا،امابعد،اے لوگو!بلاشبہ سورج اور چاند اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔یہ کسی کی موت یا زندگی کی وجہ سے گرہن زدہ نہیں ہوتے۔جب تم ان کو گرہن زدہ دیکھو تو مسجدوں کی طرف دوڑو۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھیں آنسو بہانے لگیں۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی ،اے اللہ کے رسول ! آپ اللہ کے رسول ہوکر روتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،یقیناً میں ایک بشر ہی ہوں،میری آنکھیں بہہ رہی ہیں،دل دہل رہا ہے،لیکن ہم ایسی بات نہیں کہیں گے،جو ربّ تعالیٰ کو ناراض کرے۔اللہ کی قسم !

اے ابراہیم! ہم تیری وجہ سے غمگین ہیں۔ ابراہیم اٹھارہ ماہ کی عمر میں فوت ہو گئے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا، جنت میں اس کے لیے دودھ پلانے والی عورت کا انتظام ہے۔''

(الطبقات الکبریٰ لابن سعد : ١ /١٤٢۔١٤٣، وسندہٗ حسنٌ)

حافظ ذہبی رحمہ اللہ (٦٧٣۔٧٤٨ھ) لکھتے ہیں:

النبیّ صلّی اللّٰه علیه وسلّم سیّد البشر ، وهو بشر ، یأکل ویشرب وینام ویقضی حاجته ویمرض ویتداوی ویتسوّک ، لیطیّب فمه ، فهو فی هذا کسائر المؤمنین ، فلمّا مات ــ بأبی هو وأمی ــ صلّی اللّٰه علیه وسلّم عمل به کما یعمل بالبشر ، من الغسل والتنظیف والکفن واللحد والدفن . . .

''نبیِ اکرم ﷺ سید البشر تھے، آپ بشر تھے، کھاتے تھے، پیتے تھے، سوتے تھے، قضائے حاجت کرتے تھے، بیمار ہوتے تھے، دوائی استعمال کرتے تھے اور اپنے منہ کو صاف کرنے کے لیے مسواک کرتے تھے۔ ان سب کاموں میں آپ ﷺ بشر تھے۔ میرے ماں باپ آپ ﷺ پر فدا ہوں! جب آپ ﷺ فوت ہوئے تو آپ ﷺ کے ساتھ وہی معاملہ کیا گیا، جو بشر کے ساتھ کیا جاتا ہے، یعنی آپ ﷺ کو غسل دیا گیا، کفن دیا گیا، لحد کھودی گئی اور دفن کیا گیا۔۔۔''

(میزان الاعتدال للذهبی : ٢ /٦٤٩، ت : ٥١٨٣)

قاضی عیاض رحمہ اللہ (م٥٤٤ھ) لکھتے ہیں: **محمّد صلّی اللّٰه علیه وسلّم وسائر الأنبیاء من البشر ، أرسلوا إلی البشر .**

''محمد ﷺ اور باقی تمام انبیائے کرام بشر تھے، ان کو بشروں کی طرف مبعوث کیا گیا تھا۔''

(الشفا بتعریف حقوق المصطفٰی للقاضی عیاض : ٢/٩٥)

ملا علی قاری حنفی (م١٠١٤ھ) لکھتے ہیں: **قال الطیبیّ : هو کقوله تعالیٰ : ﴿ قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ﴾ ، أی کونی إمرأ مثلکم علّة لکونی مقبوضا ، لا أعیش أبدا . . .** ''طیبی کہتے ہیں کہ یہ ایسے ہی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ﴾ (اے نبی! کہہ دیجیے کہ میں تمہاری طرح ایک بشر ہوں)، یعنی میرا تمہاری طرح بشر ہونا میرے فوت ہونے کی علت ہے کہ میں ہمیشہ نہیں رہوں گا۔۔۔"

(مرقاة المفاتيح لملا علی القاری الحنفی : ۱۹۹/۲)

ان دلائل کے بعد ایک انتہائی اہم فتویٰ ملاحظہ فرمائیں:

فإن قلت : هل العلم بكونه صلّى الله عليه وسلّم بشرا ، ومن العرب ، شرط في صحّة الإيمان ؟ قال : أو هو من فرض الكفاية ؟ أجاب الشيخ وليّ الدين العراقيّ بأنّه شرط في صحّة الإيمان ، قال : لو قال شخص : أومن برسالة محمّد صلّى الله عليه وسلّم إلى جميع الخلق ، ولكنّي لا أدري هل هو من البشر أو الملائكة ، أو من الجنّ ، أو لا أدري أهو من العرب أو العجم ؟ فلا شكّ في كفره ، لتكذيبه للقرآن وجحده ما تلقّته قرون الإسلام خلفا عن سلف ، وصار معلوما بالضرورة عند الخاصّ والعامّ ، ولا أعلم في ذلك خلافا ، فلو كان غبيّا لا يعرف ذلك وجب تعليمه إيّاه ، فإن جحده بعد ذلك حكمنا بكفره .

"اگر آپ یہ کہیں کہ کیا اس بات کا جاننا کہ آپ ﷺ بشر تھے اور آپ ﷺ کا تعلق عرب سے ہے، ایمان کی صحت کے لیے شرط ہے یا فرض کفایہ ہے؟ تو شیخ ولی الدین العراقی رحمہ اللہ اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ یہ ایمان کی صحت کے لیے شرط ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں اس بات پر ایمان رکھتا ہوں کہ محمد ﷺ تمام مخلوقات کے لیے رسول بن کر آئے ہیں، لیکن میں یہ نہیں جانتا کہ آپ ﷺ بشر تھے، فرشتہ تھے یا جن تھے یا یہ کہے کہ میں نہیں جانتا کہ آپ ﷺ کا تعلق عرب سے ہے یا عجم سے؟ تو اس کے کفر میں کوئی شبہ نہیں رہا، کیونکہ اس نے قرآنِ مجید کی تکذیب کی ہے اور ایسی چیز کا انکار کیا ہے، جو بعد والے اپنے اسلاف سے سیکھتے چلے آئے ہیں۔ یہ بات تو خاص وعام کے نزدیک یقینی طور پر معلوم ہو چکی ہے۔ مجھے اس کے بارے میں اختلاف کا کوئی علم نہیں۔ اگر کوئی غبی شخص ایسا کہے تو اس کو اس بات

(آپ ﷺ کی بشریت اور آپ ﷺ کے عربی ہونے) کی تعلیم دینا واجب ہے اور اگر اس نے پھر بھی اس کا انکار کر دیا تو ہم اس پر کافر ہونے کا حکم لگائیں گے۔۔۔"

(المواهب اللدنية لاحمد القسطلاني: ٣ /١٥٤، تفسير روح المعاني للآلوسي الحنفي: ١١٣/٤)

اسی طرح حنفی مذہب کے معتبر ترین فتاویٰ میں لکھا ہوا ہے کہ:

ولو قال: لا أدری أنّ النبیّ صلّی اللّٰه علیه وسلّم کان إنسیّا أو جنیّا یکفر.

"اگر کوئی شخص کہے کہ میں نہیں جانتا کہ آپ ﷺ انسان تھے یا جن تو اسے کافر کہا جائے گا۔" (الفتاوى التاتارخانية: ٤٨٠/٥، فتاوى عالمگيرى: ٢٦٣/٢)

اتنی واضح حدیثی نصوص اور فقہائے کرام کی آراء کے بعد بھی اس "قبوری فرقہ" نے شریعت کی تحریف و انکار، اللہ تعالیٰ، اس کے رسول ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی گستاخی، ائمہ اہل سنت والجماعت کی مخالفت اور توہینِ رسالت کی انتہا کر دی ہے، جیسا کہ امامِ بریلویت احمد یار خان نعیمی بریلوی لکھتے ہیں: " قُلْ کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ﴿بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ﴾ کہنے کی حضور کو اجازت ہے۔" (مواعظ نعیمیہ از احمد یار خان بریلوی: ص ۱۱۵، «جاء الحق» از احمد یار خان نعیمی: ۱۷۵/۱)

تبصرہ: ① ذرا ان سے پوچھئے کہ قُلْ کا لفظ تو ﴿قُلْ إِنَّمَا إِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾ (اے نبی! آپ کہہ دیجیے کہ تمہارا الٰہ تو صرف ایک ہی ہے) میں بھی ہے۔ کیا یہ کہنے کی اجازت بھی آپ ﷺ کے علاوہ کسی کو نہیں؟

سنی امام ابوجعفر طبری رحمہ اللہ (۲۲۴-۳۱۰ھ) فرماتے ہیں: **یقول تعالی ذکره: قل لهؤلاء المشرکین یا محمد! إنّما أنا بشر مثلکم من بنی آدم، لا علم لی إلّا ما علّمنی اللّٰه، وإنّ اللّٰه یوحی إلیّ أنّ معبودکم الذی یجب علیکم أن تعبدوه ولا تشرکوا به شیئا، معبود واحد لا ثانی له...**

''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے محمد (ﷺ)! آپ ان مشرکین سے کہہ دیجیے کہ میں تمہاری طرح بنی آدم میں سے ایک بشر ہوں۔ مجھے اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی باتوں کے سوا کوئی علم نہیں۔ اللہ تعالیٰ میری طرف وحی فرماتا ہے کہ جس کی عبادت کرنا اور جس سے شرک نہ کرنا تمہارے اوپر واجب ہے، تمہارا وہ معبود ایک ہی ہے، اس کا کوئی ثانی نہیں۔'' (تفسیر الطبری: ۱۳۵/۱۸)

نیز لکھتے ہیں: **يقول تعالىٰ ذكره : قل يا محمّد ! لهؤلاء المعرضين عن آيات الله من قومك : أيها القوم ! ما أنا إلّا بشر من بنى آدم ...**

''اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، اے محمد (ﷺ)! آپ اللہ تعالیٰ کی آیات سے اعراض کرنے والے اپنی قوم کے ان لوگوں سے کہہ دیجیے کہ اے قوم! میں تو بس آدم کی اولاد میں سے ایک بشر ہی ہوں۔'' (تفسیر الطبری: ۴۲۹/۲۱)

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے بھی آپ ﷺ کو بشر کہا ہے، پھر صحابہ کرام کے بارے میں کیا خیال ہے؟ جب کہ نعیمی صاحب خود لکھتے ہیں: ''ہم بھی عقیدے کے ذکر میں کہتے ہیں کہ نبی بشر ہوتے ہیں۔'' («جاء الحق» از احمد یار خان: ۱۸۲/۱)

نیز لکھتے ہیں: ''نبی جنسِ بشر میں آتے ہیں، جن یا فرشتہ نہیں ہوتے۔''

(«جاء الحق» از نعیمی: ۱۷۳/۷)

۲ نعیم الدین مرادآبادی بریلوی لکھتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ نے خلق کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے جن پاک بندوں کو اپنے احکام پہنچانے کے واسطے بھیجا، ان کو نبی کہتے ہیں، انبیاء وہ بشر ہیں، جن کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آتی ہے۔''

(کتاب العقائد از نعیم الدین مراد آبادی بریلوی: ص ۸)

مزید لکھتے ہیں: ''نبی صرف انسانوں میں سے ہوتے ہیں اور ان میں سے بھی فقط مرد، کوئی عورت نبی نہیں ہوئی۔۔۔'' (کتاب العقائد: ص ۱۲)

۳ امجد علی بریلوی لکھتے ہیں: ''انبیاء سب بشر تھے اور مرد، نہ کوئی جن

نبی ہوا، نہ عورت۔'' (بہار شریعت : ۸/۱)

یادرہے کہ بہارِ شریعت کا یہ حصہ احمد رضا خان بریلوی کا تصدیق شدہ ہے۔

④ امام بریلویت احمد رضا خان بریلوی کے ہم عصر اور احمد یار خان نعیمی بریلوی کے استاذ محمد نعیم الدین مراد آبادی بریلوی سورۂ ہود کی آیت نمبر ۲۷ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''(بشر کو نبی نہ ماننا۔از ناقل) اس گمراہی میں بہت سی امتیں مبتلا ہو کر اسلام سے محروم رہیں۔قرآنِ پاک میں جابجا ان کے تذکرے ہیں۔امت میں بھی بہت سے بدنصیب سید الانبیاء ﷺ کی بشریت کا انکار کرتے اور قرآن وحدیث کے منکر ہیں۔''

(خزائن العرفان فی تفسیر القرآن از نعیم الدین مراد آبادی : ۳۲٤، مطبوعه تاج کمپنی لمیٹڈ)

تحریف : جب یہی مراد آبادی بریلوی کی تفسیر ''ضیاء القرآن'' لاہور وغیرہ نے مراد آبادی صاحب کی وفات کے بعد شائع کی تو مذکورہ عبارت یوں تبدیل کر دی: ''اس گمراہی میں بہت سے بدنصیب سید الانبیاء کو بشر کہتے اور ہمسری کا خیالِ فاسد رکھتے ہیں۔اللہ تعالیٰ انہیں گمراہی سے بچائے۔''

(خزائن العرفان از مراد آبادی : ٤٠٣، مطبوعه ضیاء القرآن پبلی کیشنز ، لاهور)

قارئین کرام! کیا یہ علمی خیانت اور بددیانتی نہیں ہے؟ فیصلہ بریلوی عوام کریں!

رسول اللہ ﷺ کی گستاخی :

احمد یار خان نعیمی بریلوی لکھتے ہیں: ''نیز اس آیت ﴿ قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ ﴾ میں کفار سے خطاب ہے، چونکہ ہر چیز اپنی جنس سے نفرت کرتی ہے، لہٰذا فرمایا گیا کہ اے کفار! تم مجھ سے گھبراؤ نہیں، میں تمہاری جنس سے ہوں، یعنی بشر ہوں۔شکاری جانوروں کی سی آواز نکال کر شکار کرتا ہے، اس سے کفار کو اپنی طرف مائل کرنا مقصود ہے۔اگر دیوبندی بھی کفار ہیں تو ان سے بھی یہ خطاب ہو سکتا ہے۔۔۔'' («جاء الحق» : ۱/۱۷٦)

تبصرہ : ① کیا مشرکینِ مکہ آپ ﷺ کو غیر جنس سمجھ کر بھاگتے تھے؟

② یہ بات تو نبیٔ اکرم ﷺ سے پہلے انبیائے کرام نے بھی فرمائی تھی۔ کیا ان کا بھی یہی مقصد تھا؟

③ حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے فرمایا:

ولکن إنّما أنا بشر مثلکم ، أنسی کما تنسون ، فإذا نسیت فذکّرونی .

''لیکن میں تم جیسا بشر ہوں، میں بھول جاتا ہوں، جس طرح تم بھول جاتے ہو، جب میں بھول جاؤں تو مجھے یاد کروادیا کرو۔''

(صحیح البخاری : ۵۸/۱، ح : ۴۰۱، صحیح مسلم : ۲۱۲/۱، ح : ۵۷۲)

یہاں تو نبیٔ اکرم ﷺ اپنے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو فرمارہے ہیں کہ میں تمہارے جیسا بشر ہوں۔ بات سیدھی سادھی تھی کہ کفار کا نظریہ تھا کہ بشریت رسالت کے منافی ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ کفار کے بقول رسول اللہ ﷺ بشر تھے اور ان کے نزدیک بشر رسالت کے منصب پر فائز نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیتِ کریمہ نازل فرمائی تھی، لیکن نعیمی بریلوی صاحب نے کس طرح واضح بات کو الجھانے کی کوشش کی اور اس کو بعید از عقل اور ناقابل فہم بنادیا ہے۔

نعیمی صاحب آپ ﷺ کے منصبِ نبوت ورسالت کا انکار تو نہ کرسکے، لیکن آپ کو ایک دھوکہ باز بہروپیے اور دغاباز شکاری باور کرانے کی انتہائی مذموم کوشش کرکے نبیٔ اکرم ﷺ کی توہین اور گستاخی کی ہے۔ **العیاذ باللہ !**

دوسری بات یہ ہے کہ جب کفار نے یہ کہا کہ بشریت رسالت کے منافی ہے، جبکہ نبیٔ اکرم ﷺ بشر ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی بشریت کی نفی نہیں کی، بلکہ یہ فرمایا کہ آپ ﷺ سے پہلے نبی بھی بشر تھے۔ زمین پر انسان بستے ہیں، لہٰذا انسانوں کی رہنمائی کے لیے انسان

ہی مبلغ ہوسکتا ہے۔اسی طرح آپ ﷺ کی زبانِ نبوت سے بھی اسی حقیقت کا اعلان کروایا۔

بقول ان کے اگر نبیٔ اکرم ﷺ بشری لبادہ اوڑھ کر آئے اور جنس کے اعتبار سے نوری تھے تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو یہ بات چھپانے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کے بیان کرنے میں آخر کیا چیز مانع تھی؟ پھر سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعا: ﴿ رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ ﴾ کا کیا مطلب ہے؟ اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿ لَقَدۡ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اِذۡ بَعَثَ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡ اَنۡفُسِهِمۡ ﴾ کا کیا معنیٰ اور فرمانِ الٰہی: ﴿ لَقَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ ﴾ کا کیا مفہوم؟؟؟

پھر یہ کہنا کہ نبیٔ اکرم ﷺ نور تھے، بشریت کا روپ دھار کر آئے تھے، اس پر دلیل کیا ہے؟ جبکہ بریلویوں کے مفتی احمد یار خان نعیمی قرآنی آیات سے ثابت کرتے ہیں کہ:

''عقائد میں تخمینے، قیاس، اٹکل کافی نہیں، اس کے لیے یقینِ شرعی درکار ہے۔''

(تفسیر نور العرفان: ٢٣٤، ٣٣٨، ٧٨٢)

بات واضح ہے کہ اس آیتِ مبارکہ کا مطلب یہی ہے کہ اے نبی! آپ ﷺ کہہ دیجیے کہ میں بس تمہارے ہی جیسا بشر ہوں، میرے پاس وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، یعنی میں بھی بشر ہوں، تم بھی بشر ہو، میں تمہاری جنس سے ہوں، صرف میرا رتبہ اور مقام بلند ہے، کیونکہ میرے ربّ نے مجھے نبوت و رسالت سے نواز کر لازوال اعزاز بخشا ہے۔ بات بھی صحیح ہے کہ اولادِ آدم میں اعلیٰ و ارفع ہستی رسول اللہ ﷺ ہی کی ہے۔ اس بات میں کسی کے لیے بھی تاویل و انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ اِلَّا مَنۡ سَفِهَ نَفۡسَهٗ!

کمال تو اس میں ہے کہ آپ ﷺ کو بشر مان کر سید الانبیاء والمرسلین، سید ولدِ آدم فی الدنیا والآخرہ اور رحمۃ للعالمین مانا جائے، ورنہ آپ ﷺ کے معجزات کی حیثیت ختم ہو کر رہ جائے گی۔

جناب احمد یار خان نعیمی صاحب آیت کا ایک جواب یہ دیتے ہیں کہ:

''قرآنِ کریم میں ہے: ﴿ مَثَلُ نُوۡرِهٖ كَمِشۡكٰوةٍ فِيۡهَا مِصۡبَاحٌ ﴾ ربّ کے نور کی

مثال ایسی ہے، جیسے ایک طاق کہ اس میں ایک چراغ ہے۔اس آیت میں بھی کلمہ 'مثل' ہے تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ نورِ خدا چراغ کی طرح روشن ہے؟'' («جاء الحق»: ١/١٧٧)

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ کا وصفی نور مراد نہیں ہے، بلکہ یہاں وہ نور مراد ہے، جو اللہ تعالیٰ اپنے مؤمن بندے کے دل میں اپنی معرفت ومحبت اور ایمان وذکر کے سبب سے ودیعت فرمادیتے ہیں۔ یہ نور مخلوق ہے، لہٰذا یہاں مخلوق کو تشبیہ مخلوق سے دی جارہی ہے، نہ کہ اللہ تعالیٰ کے وصفی نور سے۔

اگر کوئی سوال کرے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نور مؤمنوں کے دلوں میں پیدا کردیا ہے، وہ نورِ ایمانی ہے، وہ تو چراغ کی نسبت اقویٰ ہے۔تشبیہ میں قاعدہ یہ ہے کہ مشبہ بہ، مشبہ کی نسبت اقویٰ ہوتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ کبھی کبھی مشبہ بہ، مشبہ کی نسبت مشہور ہوتا ہے، اس وجہ سے جو مشہور ہو، اسے مشبہ بہ بنادیا جاتا ہے، اگرچہ وہ اس کی نسبت قوی نہ بھی ہو، کیونکہ سارے لوگ اس کو جانتے ہیں۔ادھر بھی اسی طرح ہے۔

جناب احمد یار خان نعیمی بریلوی صاحب لکھتے ہیں: ''قرآن میں ہے: ﴿ وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ ﴾ نہیں ہے کوئی جانور زمین میں، نہ کوئی پرندہ جو اپنے بازوؤں سے اڑتا ہو، مگر وہ تمہاری طرح امتیں ہیں۔

یہاں بھی کلمہ 'مثل' موجود ہے تو کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ ہر انسان گدھے، اُلّو جیسا ہے؟''

(«جاء الحق»: ١٧٧/٨)

اس کا جواب یہ ہے کہ گروہ وامت ہونے میں تم دونوں برابر ہو، یعنی جس طرح تم ایک امت ہو، اسی طرح وہ بھی ایک امت ہیں۔واضح رہے کہ ﴿ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ ﴾ میں اس بات کی تصریح کردی گئی ہے کہ میں تم جیسا بشر ہوں، اگر إنّما أنا مثلکم ہوتا تو یہ گمان واقع ہوسکتا تھا کہ میں تم جیسا ہوں، نہ معلوم مماثلت کس چیز میں ہے؟ بشر کے لفظ سے تصریح کردی گئی ہے کہ مماثلت بشریت میں ہے، کسی اور چیز میں نہیں، فرق یہ ہے کہ ﴿ يُوحَى إِلَيَّ ﴾ یعنی

میری طرف وحی کی جاتی ہے اور تمہاری طرف وحی نہیں آتی۔

جناب احمد یار خان نعیمی بریلوی لکھتے ہیں: '' إِنَّمَا کا حصر اضافی ہے، نہ کہ حقیقی، یعنی میں نہ خدا ہوں، نہ خدا کا بیٹا، بلکہ تمہاری طرح خالص بندہ ہوں۔'' («جاء الحق» : ۱/۱۷۷)

اس کا جواب یہ ہے کہ مخاطبین کا یہ نظریہ وعقیدہ نہیں تھا کہ آپ ﷺ اللہ کے بیٹے ہیں یا آپ ﷺ خود اللہ ہیں، بلکہ یہ بات تو ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں آئی تھی۔ یہاں تو معاملہ برعکس ہے، مخاطبین آپ ﷺ کو بشر سمجھتے تھے۔ آپ ﷺ نے اپنی بشریت کی نفی نہیں کی، بلکہ یہ فرمایا کہ میں بشر ہی ہوں، البتہ مجھ پر وحی آتی ہے، جو تمہارے پاس نہیں آتی۔

جناب احمد یار خان نعیمی بریلوی صاحب لکھتے ہیں: ''روزۂ وصال کے بارے میں حضور نے فرمایا، أَيُّكُمْ مِثْلِيْ تم میں ہم جیسا کون ہے؟'' («جاء الحق» : ۱/۱۷۸)

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں قوت وطاقت میں مماثلت کی نفی ہے کہ تم طاقت میں میری مثل نہیں ہو، ساتھ خود ہی آپ ﷺ نے وجہ بھی بیان کردی کہ میرا ربّ مجھے روزے کی حالت میں ہی کھلاتا پلاتا رہتا ہے، اس سے جنسِ بشریت کی نفی کیسے ہوگئی؟

بعض لوگ رسول اللہ ﷺ کے معجزات پیش کرکے بشریت کی نفی کا ثبوت دیتے ہیں۔ نبی سے معجزات کا صادر ہونا اعلام نبوت میں سے ہے، معجزہ تائیدِ الٰہی ہوتا ہے، اس سے بشریت کی نفی نہیں ہوتی۔ آپ ﷺ کو بشر تسلیم کرکے معجزات کو ماننا درحقیقت آپ ﷺ کے کمال کو تسلیم کرنا ہے۔ معجزات تو پہلے نبیوں سے بھی صادر ہوئے تھے، کیا وہ بھی بشریت سے خارج تھے؟

جناب احمد یار خان نعیمی بریلوی صاحب لکھتے ہیں: ''اس طرح کہ اس آیت میں ہے: ﴿ بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ﴾ یہ نہیں ہے کہ إنسان مثلکم، بشر کے معنیٰ ہیں ذو بشرة۔''
(«جاء الحق» : ۱/۱۷۸)

اگر إنسان مثلکم فرمایا جاتا تو مطلب یہ تھا کہ انس کرنے والا ہوں، آپ جیسا۔ یہاں تشبیہ انس میں آجاتی۔ اس سے جنسیت کا پتا نہ چلتا کہ آپ ﷺ بشر ہیں یا کوئی اور جنس۔

بشر سے تخصیص وتصریح آ گئی کہ آپ ﷺ کی جنس بشر ہے، جیسا کہ آدم علیہ السلام کو ''ابوالبشر'' کہا جاتا ہے، ''ابوالانسان'' کوئی نہیں کہتا۔اسی طرح سیدنا نوح علیہ السلام کو ''ابوالبشر ثانی'' کہا جاتا ہے، ''ابوالانسان ثانی'' کوئی نہیں کہتا۔

بعض لوگ نبیٔ اکرم ﷺ کی خصوصیات بیان کرکے آپ ﷺ کی بشریت کی نفی کرتے ہیں ۔ یہ بھی غلط ہے، کیونکہ نبی کو اللہ تعالیٰ خواص سے نواز کر اس کی تائید کرتے ہیں ۔ پہلے انبیاء کے بھی خواص تھے۔کیا وہ اس وجہ سے بشریت سے خارج سمجھے جائیں گے؟ کیا ان کے نزدیک نبی اور عام انسان میں کوئی فرق نہیں؟ بعض خصائص کی بنا پر جنس مختلف نہیں ہوتی۔

قبوریوں کا عقیدہ ہے کہ نبیٔ اکرم ﷺ اللہ تعالیٰ کے نور کا حصہ ہیں۔انسانی شکل میں متشکل ہوکر آئے تھے،جنسِ بشریت سے آپ کا کوئی تعلق نہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ نور ہیں تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور دیگر ازواجِ مطہرات سے آپ ﷺ کا نکاح کیسا ؟ کیونکہ خود احمد یار خان نعیمی قرآنِ کریم سے ثابت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''دنیا میں نکاح کے لیے جنسیت ضروری ہے۔''

(تفسیر نور العرفان : ص ۷۹٤)

امامِ بریلویت احمد یار خان نعیمی بریلوی لکھتے ہیں: ''ہاروت،ماروت دو فرشتے ہیں، جو تمام فرشتوں سے زیادہ عابد وزاہد تھے۔ایک دفعہ بشکل انسانی دنیا میں قاضی وحاکم بنا کر بھیجے گئے۔ایک عورت زہرہ کا مقدمہ پیش ہوا،جس پر یہ عاشق ہو گئے اور اس کے عشق میں بہت گناہ کر بیٹھے۔ادریس علیہ السلام کا زمانہ تھا۔ان کے وسیلے سے توبہ تو قبول ہوئی،مگر بابل کے کنوئیں میں قید کر دیئے گئے اور انہیں جادو کی تعلیم کے لیے مقرر کر دیا گیا۔ پتا لگا کہ نورانی فرشتے جب شکل انسانی میں آئیں تو ان میں کھانے پینے، بلکہ جماع کرنے کی قوتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔۔۔لہٰذا حضور بھی اللہ کے نور ہیں،مگر بشری لباس میں آئے تو کھاتے، پیتے،سوتے، جاگتے تھے۔''

(تفسیر نور العرفان : ص ٢٤)

یہ سب اسرائیلی روایات ہیں۔قرآنی نصوص کے خلاف ہیں، لہٰذا ہم ان کی تکذیب کرتے ہیں۔قرآنِ کریم میں تو سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے پاس فرشتوں کے مہمان بننے کا ذکر ہے۔ جب ابراہیم علیہ السلام ان کے لیے بچھڑا بھون کر لائے تو انہوں نے نہ کھایا۔ جب ابراہیم علیہ السلام اس بات سے پریشان ہوئے تو انہوں نے بتایا کہ ہم تو اللہ تعالیٰ کے فرشتے ہیں۔(ھود: ۶۹۔۷۰)

معلوم ہوا کہ قرآنی نصوص کے مطابق جب فرشتے، بشری لبادے میں آئیں تو بھی کھانے، پینے اور دوسری حاجاتِ انسانی سے مبرا ہی ہوتے ہیں۔قرآنِ کریم کی صریح نصوص کے خلاف اسرائیلی روایات سے استدلال کرنا بدعتی لوگوں ہی کا کام ہے!

احمد یار خان نعیمی بریلوی لکھتے ہیں: ''ان کو بشر یا انسان کہہ کر پکارنے یا حضور علیہ السلام کو یا محمد یا کہہ اے ابراہیم کے باپ یا اے بھائی باوا وغیرہ برابری کے الفاظ سے یاد کرنا حرام ہے۔''(((جاء الحق)): ۱/۱۷۳)

ہم بھی مذکورہ الفاظ کے ساتھ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارنا درست اور جائز نہیں سمجھتے، کیونکہ ان میں کوئی امتیازی وصف نہیں پایا جاتا، ویسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم باعتبارِ جنس بشر ہی ہیں۔

رہا مسئلہ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یا محمد کہہ کر پکارنے کا تو یہ بریلویوں کا کام ہے۔ باوجود اس کے کہ احمد یار خان بریلوی وغیرہ اس کے ساتھ پکارنا حرام قرار دیتے ہیں! اب بھی ان کی مساجد میں یا محمد کے بورڈ سجے ہوئے ہیں، کیوں؟

بریلوی حضرات نہ صرف نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کا انکار کرتے ہیں، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نورِ الٰہی کا حصہ سمجھتے ہیں، جیسا کہ امامِ بریلویت احمد یار خان نعیمی گجراتی کہتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نور سے ہیں اور ساری مخلوق آپ کے نور سے ہے۔''

(مواعظ نعیمیه از احمد یار خان بریلوی: ص ۱۴، تفسیر نور العرفان: ص ۷۳۲)

یہودیوں نے عزیر علیہ السلام کو اور عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا اور مشرکینِ مکہ نے فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہا تو بریلویوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کے نور کا حصہ قرار دیا۔ گویا ان

کے نزدیک ساری مخلوق اللہ کے نور کا ٹکڑا ہے۔ العیاذ باللہ!

اس باطل اور کفریہ عقیدے کے بعد بھی یہ لوگ اہل سنت والجماعت کہلوانے میں ذرا برابر جھجک محسوس نہیں کرتے، جبکہ اللہ تعالیٰ اس مشرکانہ عقیدے کا ردّ یوں فرماتے ہیں:

﴿ وَجَعَلُوا لَهُ مِنْ عِبَادِهِ جُزْءًا ﴾ (الزخرف: ١٥)

''اورانہوں نے اس (اللہ) کے لیے اس کے بندوں میں سے ٹکڑا اٹھہرایا۔'' (احمد رضا)

اور اس طرح کی باتیں کرنے والوں کے بارے میں ارشاد فرمایا:

﴿ ذَلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ أَنَّى يُؤْفَكُونَ ﴾ (التوبة: ٣٠)

''یہ باتیں وہ اپنے منہ سے بکتے ہیں، اگلے کافروں کی سی بات بناتے ہیں، اللہ انہیں مارے، کہاں اوندھے جاتے ہیں۔'' (ترجمہ احمد رضا خان بریلوی)

اہل بدعت ﴿ قَدْ جَاءَ كُمْ مِنَ اللّٰهِ نُورٌ وَّكِتَابٌ مُبِينٌ ﴾ سے استدلال کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نور تھے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہاں نور سے مراد قرآنِ مجید ہے۔ یہاں صفت کا عطف صفت پر ہے، جیسا کہ سورۂ نساء کی آیت نمبر ۱۷۴ اور سورۂ تغابن کی آیت نمبر ۸ میں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر نور سے مراد آپ ﷺ لیے جائیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا:

یعنی بالنور محمّدًا صلّى الله عليه وسلّم الذى أنار الله به الحقّ، وأظهر به الإسلام، ومحق به الشرك. ''نور سے مراد محمد ﷺ ہیں، جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے حق کو روشن کیا، اسلام کو غالب کیا اور شرک کو مٹایا۔۔۔'' (تفسير ابن جرير: ١٠/١٤٣)

ثابت ہوا کہ نور آپ ﷺ کا صفاتی نام ہے، باعتبارِ جنس آپ ﷺ بشر ہی ہیں اور آپ ﷺ کی پیدائش مٹی سے ہی ہوئی ہے، کیونکہ:

① امام بریلویت احمد یار خان نعیمی بریلوی کہتے ہیں: ''یعنی سب انسانوں کی اصل آدم و حوا ہیں اور ان کی اصل مٹی ہے تو تم سب کی اصل مٹی ہوئی۔۔۔''

(تفسیر نور العرفان : ص ۸۲۵)

مزید لکھتے ہیں: ''اس سے معلوم ہوا کہ نبی ہمیشہ انسان اور مرد ہوئے۔ کوئی عورت یا جن یا فرشتہ وغیرہ نبی نہیں۔ بخاری کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ہمیشہ حسب ونسب میں اونچے اور اعلیٰ خاندان میں ہوئے۔'' (تفسیر نور العرفان : ص ٥١٤)

نیز لکھتے ہیں: ''یعنی اگر ربّ تعالیٰ کسی کو نبی بناتا تو فرشتے کو بناتا، نہ کہ ہم جیسے انسانوں کو، کیونکہ نبوت انسانی قابلیت سے اعلیٰ درجہ ہے۔ یہ لوگ (کفار) لکڑی پتھر کو خدا مان لیتے تھے، مگر انسان کو نبی ماننے میں تامل کرتے تھے۔'' (تفسیر نور العرفان : ص ۷٦٢)

ہم کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کے نورِ ہدایت ہونے میں شک کرنے والا انسان کافر ہے، مگر اس سے بشریت کی نفی قطعاً نہیں ہوتی۔

اسی طرح ایک اور روایت ((إنّ أوّل ما خلق اللّٰه نوری)) پیش کی جاتی ہے، لیکن یہ روایت موضوع (من گھڑت)، باطل، جعلی، خود ساختہ، بناوٹی، بے اصل اور رافضیوں کی گھڑی ہوئی ہے، جو کہ ہمارے امام اعظم محمد رسول اللہ ﷺ پر افترا اور جھوٹ ہے۔

② احمد یار خان نعیمی بریلوی صاحب لکھتے ہیں: ''یعنی یہ کفار آپ پر ایمان تو نہ لائے، بلکہ تعجب کرنے لگے کہ انسان کو نبوت کیسے مل گئی؟ یہ تو کسی فرشتے کو ملنی چاہیے تھی۔ افسوس ہے کہ یہ لوگ لکڑی، پتھر کو خدا ماننے لگے، مگر افضل البشر کو نبی ماننے میں تامل کرتے تھے۔'' (تفسیر نور العرفان : ص ۸۲٦)

اس کے باوجود احمد یار خان نعیمی گجراتی بریلوی صاحب لکھتے ہیں:

'' إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ وغیرہ آیات جو بظاہر شانِ مصطفوی کے خلاف معلوم ہوتی ہیں، وہ متشابہات میں سے ہیں، لہٰذا ان کے ظاہر سے دلیل پکڑنا غلط ہے۔'' («جاء الحق» : ۱۷۸/۱)

اہل بدعت کے علاوہ اس آیتِ کریمہ کو کسی نے متشابہات میں ذکر نہیں کیا، لہٰذا یہ قرآنِ کریم کی معنوی تحریف ہے۔ اس سے شانِ مصطفوی میں کوئی نقص نہیں آتا۔ بات یہ ہے کہ یہ لوگ

اپنے باطل عقیدہ کے ثبوت میں خواہشات کی پیروی کرتے ہیں۔ائمہ اہل سنت کے فہم کو ترک کر کے قرآنِ مجید کو اپنی رائے سے سمجھتے ہیں۔

جناب احمد یار خان نعیمی لکھتے ہیں: ''عصائے موسیٰ سانپ کی شکل میں ہو کر سب کچھ نگل گیا، ایسے ہی ہمارے حضور ﷺ نوری بشر ہیں۔''(مرآة المناجیع از نعیمی: ۲٤/۱)

یہ بے دلیل اور باطل عقیدہ ہے، جو قرآن وسنت اور اجماعِ امت کے سراسر خلاف ہے۔ اہل سنت کے کسی ثقہ امام کا یہ عقیدہ نہ تھا۔ یہ محض اس دور کے اہل بدعت کی اختراع ہے۔

حالتِ نماز میں قرآنِ کریم کو پکڑ کر قرائت!

غلام مصطفےٰ ظہیر امن پوری

جب آدمی حافظِ قرآن نہ ہو تو بوقتِ ضرورت قرآنِ کریم ہاتھ میں پکڑ کر قرائت کر سکتا ہے۔ محدثین کرام رحمہم اللہ اس کو جائز سمجھتے تھے۔ اسی طرح اگر سامع حافظ نہ ہو تو وہ بھی ایسا کر سکتا ہے۔ جیسا کہ:

① سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں روایت ہے: **کانت عائشة یؤمّها عندها ذکوان من المصحف .** ''سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے غلام ذکوان رحمہ اللہ ان کی امامت قرآنِ مجید سے دیکھ کر کرتے تھے۔'' (صحیح البخاری: ۱/ ۹۶ تعلیقا، مصنف ابن ابی شیبة: ۲/ ۳۳۷، کتاب المصاحف لابن ابی داوٗد: ۷۹۷، السنن الکبریٰ للبیهقی: ۲/۲۵۳، وسندهٗ صحیحٌ)

حافظ نووی رحمہ اللہ (خلاصة الاحکام: ۱/ ۵۵۰) نے اس کی سند کو ''صحیح'' اور حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ (تغلیق التعلیق: ۲/ ۲۹۱) نے اس روایت کو ''صحیح'' قرار دیا ہے۔

② امام ایوب سختیانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **کان محمّد لا یری بأسا أن یؤمّ الرجل القوم ، یقرأ فی المصحف .** ''امام محمد بن سیرین تابعی رحمہ اللہ اس میں کوئی حرج خیال نہیں کرتے تھے کہ آدمی قوم کو امامت کروائے اور قرائت قرآنِ مجید سے دیکھ کر کرے۔'' (مصنف ابن ابی شیبة: ۲/۳۳۷، وسندهٗ صحیحٌ)

③ امام شعبہ رحمہ اللہ، امام حکم بن عتیبہ تابعی رحمہ اللہ سے اس امام کے بارے میں روایت کرتے ہیں، جو رمضان المبارک میں قرآنِ مجید کو ہاتھ میں پکڑ کر قرائت کرتا ہے۔ آپ رحمہ اللہ اس میں رخصت دیتے تھے۔'' (مصنف ابن ابی شیبة: ۲/۳۳۷، وسندهٗ صحیحٌ)

④ امام حسن بصری تابعی رحمہ اللہ اور امام محمد بن سیرین تابعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ نماز

میں قرآنِ مجید پکڑ کر قرائت کرنے میں کوئی حرج نہیں۔''

(مصنف ابن ابی شیبة : ۳۳۷/۲، وسندہٗ صحیحٌ)

⑤ امام عطاء بن ابی رباح تابعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حالتِ نماز میں قرآنِ مجید سے دیکھ کر قرائت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔(مصنف ابن ابی شیبة : ۳۳۷/۲، وسندہٗ صحیحٌ)

⑥ امام یحییٰ بن سعید الانصاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **لا أری بالقراء ة من المصحف فی رمضان بأسا .** ''میں رمضان المبارک میں قرآنِ مجید سے دیکھ کر قرائت کرنے میں کوئی حرج خیال نہیں کرتا۔''

(کتاب المصاحف لابن ابی داوٗد : ۸۰۵، وسندہٗ حسنٌ)

⑦ محمد بن عبداللہ بن مسلم بیان کرتے ہیں کہ میں نے امام زہری رحمہ اللہ سے قرآنِ مجید سے قرائت کر کے امامت کرانے کے بارے میں پوچھا تو آپ رحمہ اللہ نے فرمایا:

لم یزل الناس منذ کان الإسلام ، یفعلون ذلک . ''اسلام کے شروع سے لے کر ہر دور میں مسلمان ایسا کرتے آئے ہیں۔''

(کتاب المصاحف لابن ابی داوٗد : ۸۰۶، وسندہٗ حسنٌ)

⑧ امام مالک رحمہ اللہ سے ایسے انسان کے بارے میں سوال ہوا، جو رمضان المبارک میں قرآنِ مجید ہاتھ میں پکڑ کر امامت کراتا ہے۔ آپ رحمہ اللہ نے فرمایا: **لا بأس بذلک ، وإذا اضطرّوا إلی ذلک .** ''مجبوری ہو تو ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔''(کتاب المصاحف لابن ابی داوٗد : ۸۰۸، وسندہٗ صحیحٌ)

⑨ امام ایوب سختیانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **کان ابن سیرین یصلّی ، ، والمصحف إلی جنبه ، فإذا تردّد نظر فیه .** ''امام محمد بن سیرین رحمہ اللہ نماز پڑھتے تو قرآنِ مجید ان کے پہلو میں پڑا ہوتا۔ جب بھولتے تو اس سے دیکھ لیتے۔''

(مصنف عبد الرزاق : ۴۲۰/۲، ح : ۳۹۳۱، وسندہٗ صحیحٌ)

⑩ امام ثابت البنانی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں: **كان أنس يصلّى ، وغلامه يمسك المصحف خلفه ، فإذا تعايا فى آية فتح عليه .**

''سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ نماز پڑھتے تھے۔ان کا غلام ان کے پیچھے قرآنِ مجید پکڑ کر کھڑا ہوجاتا تھا۔جب آپ کسی آیت پر رک جاتے تو وہ لقمہ دے دیتا تھا۔''

(مصنف ابن ابی شیبۃ : ۳۳۷/۲، السنن الکبریٰ للبیہقی : ۲۱۲/۳، وسندہٗ صحیحٌ)

ثابت ہوا کہ قرآنِ مجید ہاتھ میں پکڑ کر قرائت کرنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی۔اس کے خلاف سلف سے کچھ ثابت نہیں۔فاسد کہنے والوں کا قول خود فاسد اور کاسد ہے۔

سعودی عرب کے مفتیٔ اعظم ، فقیہ العصر ، شیخ عبدالعزیز ابن باز رحمہ اللہ نے بھی فتح الباری(۲ /۱۸۵) کی تحقیق میں اس کو بوقتِ ضرورت جائز قرار دیا ہے۔

جولوگ کہتے ہیں کہ اگر ہاتھ میں قرآنِ کریم پکڑ کر نماز میں قرائت کرنے سے نماز فاسد ہوجاتی ہے، وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں:

❀ سیدنا ابنِ عباس رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ہمیں قرآنِ کریم ہاتھ میں پکڑ کر امامت کرانے سے منع فرمایا۔''(کتاب المصاحف : ۷۷۲)

تبصرہ : اس کی سند سخت ترین ''ضعیف'' ہے، کیونکہ:

① اس کی سند میں نہشل بن سعید راوی ''متروک'' اور ''کذاب'' ہے۔

(تقریب التہذیب : ۷۱۹۷، میزان الاعتدال : ٤ /۲۷۵)

② اس کے راوی ضحاک بن مزاحم کا سیدنا ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے سماع نہیں ہے۔

(تفسیر ابن کثیر : ٥ /۲۳٦، التلخیص الحبیر لابن حجر : ۱ /۲۱، العجاب فی بیان الاسباب لابن حجر : ص ۱۰٤)

حنفی اور دیوبندی مذہب کی معتبر ترین کتابوں میں لکھا ہے: **ولذلك قال مشايخنا فيمن صلّى ، وفى كمّه جرو كلب أنّه تجوز صلاته ، وقيّد الفقيه أبو**

جعفر الهندوانیّ الجواز بکونه مسدود الفم . ''اس واسطے ہمارے مشائخ نے اس نمازی کے بارے میں کہا ہے، جس کی حالت یہ ہے کہ اس کی آستین میں پلا (کتیا کا بچہ) ہو، اس کی نماز جائز ہے، فقیہ ابوجعفر الہندوانی نے اس جواز کو اس بات کے ساتھ مقید کیا ہے کہ کتے کا منہ (کپڑا لپیٹ کر) بند کیا ہوا ہو۔''(بدائع الصنائع : ۱ /۷٤، الدر المختار مع کشف الاستار : ۱ /۳۸، رد المحتار : ۱ /۱۵۳، حاشیة الطحطاوی علی الدر المختار : ۱ /۱۱٤۔۱۱۵، البحر الرائق لابن نجیم : ۱ /۱۰۱۔۱۰۲، فیض الباری از انور شاہ کشمیری دیوبندی : ۱ /۲۷٤، مجموعہ رسائل از مہدی حسن شاہجہانپوری دیوبندی : ۲٤۰)

آلِ تقلید کتا اٹھا کر نماز پڑھنے کو تو جائز سمجھتے ہیں، لیکن اگر قرآنِ مجید ہاتھ میں پکڑ کر نماز پڑھی جائے تو ان کے نزدیک نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ یہ قبیح بدعت ہے۔ امت میں کوئی مسلمان بھی کتا اٹھا کر نماز پڑھنے کا قائل نہیں۔ مقلدین نے یہ بدعت ایجاد کی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: من أحدث فی أمرنا هذا ما لیس منه فهو ردّ .
''جو شخص ہمارے اس دین میں ایسی چیز نکالے، جس کا وجود اس میں نہ ہو، وہ باطل ہے۔''
(صحیح البخاری : ۱ /۳۷۱، ح : ۲٦۹۷، صحیح مسلم : ۲ /۷۷، ح : ۱۷۱۸)

مشتاق علی شاہ دیوبندی نے ایک کتاب شائع کی ہے ''فقہ حنفی پر اعتراضات کے جوابات'' مکتبہ فاروقیہ، ۸ گوبند گڑھ، گوجرانوالہ، پاکستان۔ اس کتاب کے صفحہ نمبر ۳۰۸ پر اس نے فقہ حنفی پر ایک غیر حنفی کا اعتراض نقل کیا ہے کہ حنفیوں کے نزدیک ''اگر بڑے کتے کو بھی بغل میں دبائے ہوئے نماز پڑھے تو نماز فاسد نہ ہو گی۔''

مشتاق علی شاہ دیوبندی کے ممدوح محمد شریف کوٹلوی بریلوی نے اس کے تین جوابات دیئے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے: ''رسولِ کریم ﷺ اپنی نواسی امامہ بنتِ زینب کو اٹھا کر نماز پڑھا کرتے تھے۔''(فقہ حنفی پر اعتراضات کے جوابات : ص ۳۰۹)

سوال کتے کے بارے میں تھا اور جواب میں اس گستاخ نے پیارے نبیٔ اکرم ﷺ کی

پاک نواسی کا ذکر کر دیا ہے۔

حنفی مذہب کی معتبر ترین کتابوں میں لکھا ہے: **إذا قرأ المصلّی من المصحف فسدت صلاته فی قول أبی حنیفة ، لو نظر إلی فرج المطلّقة عن شهوة ، یصیر مراجعا ، ولا تفسد صلاته ، لو نظر المصلّی إلی فرج امرأة بشهوة حرمت علیه أمّها وابنتها ، ولا تفسد صلاته .**

''جب نمازی قرآنِ مجید پکڑ کر قرائت کرے تو امام ابوحنیفہ کے قول کے مطابق نماز فاسد ہو جاتی ہے، لیکن اگر طلاق شدہ عورت کے شرمگاہ کو شہوت کی نظر سے دیکھے تو رجوع ہو جائے گا، نماز بھی فاسد نہیں ہوگی۔ اگر نمازی کسی عورت کی شرمگاہ کی طرف شہوت کے ساتھ دیکھتا ہے تو اس عورت کی ماں اور بیٹی اس پر حرام ہو جائے گی، نماز فاسد نہیں ہوگی۔''

(فتاوی قاضی خان: ۱/ ٦٥، فتاوی عالمگیری: ۱/ ۱۰۱، الفتاوی التاتارخانیه: ۱/ ٥٩٤، الاشباه والنظائر لابن نجیم: ۲/۳۰۷)

امام بریلویت احمد رضا خان صاحب لکھتے ہیں: ''اگر عورت کو طلاق رجعی دی تھی، ہنوز عدت نہ گزری تھی۔ یہ نماز میں تھا کہ عورت کی فرجِ داخل (شرمگاہ کے اندرونی حصے) پر نظر پڑ گئی اور شہوت پیدا ہوئی، رجعت ہوگئی اور نماز میں فساد نہ آیا۔'' (فتاوی رضویه: ۱/ ٧٤)

قارئین کرام! یہ حنفی مذہب کی معتبر کتابیں ہیں اور یہ حنفی فقہاء ہیں اور یہ ان کی فقہ ''شریف'' ہے۔

الحاصل: بوقتِ ضرورت قرآنِ مجید ہاتھ میں پکڑ کر قرائت کی جا سکتی ہے۔ فاسد کہنے والوں کا قول فاسد ہے۔

گیارہویں ہندوستانی بدعت ہے!

غلام مصطفیٰ ظہیرامن پوری

اللہ تعالیٰ کا ہم پر بہت بڑا انعام ہے کہ اس نے ہمیں کامل شریعت عطا کی۔اس نعمتِ عظمیٰ پر اس کا شکر بجالانا چاہیے۔اس کے باوجود بہت سارے لوگ نبیٔ اکرم ﷺ کی لائی ہوئی ہدایت کو کافی نہیں سمجھتے۔آئے دن دینِ اسلام میں رخنہ اندازی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔دین کے نام پر نت نئے شکم پروری کے اسباب وذرائع متعارف کراتے رہتے ہیں۔

سادہ لوح مسلمان ان کی فریب کاریوں میں آجاتے ہیں، کیونکہ یہ ٹھگ میٹھا زہر کھلاتے ہیں۔ان کی وحشیانہ لوٹ مار کے بہت سے طریقے ہیں۔جہاں یہ تیجا،قل،جمعرات،ساتواں،دسواں،چالیسواں اور برسی کے نام پر بیوگان اور یتیموں کا بے دریغ مال ہڑپ کرجاتے ہیں، وہاں اسلامی مہینے کی گیارہ تاریخ کو ''ریفریشمنٹ'' (گیارہویں) کا اہتمام کرتے ہیں۔ان کے ''علماء'' کا کہنا ہے کہ یہ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے ایصالِ ثواب کے لیے صدقہ ہے،جبکہ ان کے عوام تو اس کو کچھ اور ہی سمجھتے ہیں۔وہ تو اسے شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے نام کی نیاز ونذر سمجھتے ہیں۔ان کا یہ اعتقادِ بد ہے کہ اگرانہوں نے گیارہویں کا دودھ نہ دیا تو اس کی وجہ سے ان کی بھینس یا گائے مرجائے گی یا بیمار ہوجائے گی یا رزق ختم ہوجائے گا یا اولاد کی موت واقع ہوجائے گی یا گھر میں نقصان ہوسکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

یہ عقیدہ شرعاً حرام وناجائز اور صریح شرک ہے۔رہا ایصالِ ثواب کے لیے صدقہ کی بات کرنا تو سوال یہ ہے کہ آخر شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کی اس قدر تعظیم کیوں؟ گیارہویں صرف انہیں کے نام پر کیوں،حالانکہ یہ لوگ عقیدہ میں شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے سخت خلاف ہیں۔شیخ رحمہ اللہ صحیح العقیدہ اور متبع سنت مسلمان تھے، جبکہ یہ بدعقیدہ اور بدعتوں کے دلدادہ ہیں۔

گیارہویں ہندوستانی بدعت ہے،جو شیعہ شنیعہ کی تقلید میں اپنائی گئی ہے،کیونکہ وہ بھی اپنے ائمہ کے لیے نیاز برائے ایصالِ ثواب دیتے ہیں۔خوب یاد رہے کہ سلف صالحین اور ائمہ اہل سنت سے یہ طریقہ ایصالِ ثواب ہرگز ہرگز ثابت نہیں۔اگر اس کی کوئی شرعی حیثیت ہوتی اور یہ اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کا باعث ہوتا تو وہ اس کا اہتمام کرتے۔

علامہ ابنِ رجب رحمہ اللہ (۷۳۶۔۷۹۵ھ) نے کیا خوب لکھا ہے:

فأمّا ما اتّفق السلف على تركه ، فلا يجوز العمل به ، لأنّهم ما تركوه إلّا على علم أنّه لا يعمل به . ''جس کام کو چھوڑنے پر سلف کا اتفاق ہو، اسے کرنا جائز نہیں، کیونکہ انہوں نے یہ جان کر اسے چھوڑا تھا کہ اس پر عمل نہیں کیا جائے گا۔''

(فضل علم السلف على علم الخلف لابن رجب : ص ۳۱)

جس کام کے چھوڑنے پر سلف صالحین متفق ہوں، اس کام کا کرنا جائز نہیں ۔ گیارہویں سلف صالحین اور ائمہ اہل سنت سے ثابت نہیں، لہٰذا یہ بدعت سیئہ اور شنیعہ ہے۔

گیارہویں باطل ہے

① علامہ شاطبی رحمہ اللہ (م ۷۹۰ھ) بدعات کا ردّ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

لو كان دليلا عليه لم يعزب عن فهم الصحابة والتابعين ، ثمّ يفهمه هؤلاء ، فعمل الأوّلين كيف كان مصادم لمقتضى هذا المفهوم ومعارض له ، ولو كان ترك العمل فما عمل به المتأخرون من هذا القسم مخالف لإجماع الأوّلين ، وكلّ من خالف الإجماع فهو مخطيء ، وأمّة محمّد صلّى الله عليه وسلّم لا تجتمع على ضلالة ، فما كانوا عليه من فعل أو ترك فهو السنّة والأمر المعتبر ، وهو الهدى ، وليس ثمّ إلّا صواب أو خطأ ، فكلّ من خالف السلف الأوّلين فهو على خطأ ، وهذا كافٍ ... ''اگر اس پر کوئی دلیل ہوتی تو فہم صحابہ وتابعین سے غائب نہ رہتی کہ بعد میں یہ لوگ اسے سمجھ لیتے ! سلف کا عمل اس مفہوم کے خلاف ومعارض کیسے تھا ؟ اگر چہ ان کا عمل یہاں ترکِ عمل ہی ہے ۔ اس طرح کی چیزوں میں متاخرین نے جو عمل کیا ہے، وہ سلف کے اجماع کے خلاف ہے اور ہر وہ شخص جو اجماع کی مخالفت کرتا ہے، وہ خطا کار ہے، کیونکہ امتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہو سکتی، لہٰذا سلف جس کام کو کرنے یا چھوڑنے پر متفق ہوں، وہی سنت اور معتبر امر ہے اور وہی ہدایت ہے ۔ کسی کام میں دو ہی احتمال ہوتے ہیں، درستی یا غلطی، جو شخص پہلے سلف کی مخالفت کرے گا، وہ خطا پر ہوگا اور یہی اس کے خطا کار ہونے کے لیے کافی ہے۔۔۔''

(الموافقات للشاطبي : ۷۲/۳)

نیز لکھتے ہیں: **فلهذا كلّه يجب على كلّ ناظر في الدليل الشرعيّ مراعاة ما**

فهـم الأوّلون ، وما كانوا عليه في العمل به ، فهو أحرى بالصواب ، وأقوم في العلم والعمل ... ''ان ساری باتوں کے پیشِ نظر شرعی دلیل میں غور کرنے والے ہر شخص کے لیے سلف کے فہم وعمل کالحاظ رکھنا فرض ہے، کیونکہ وہی درستی کے زیادہ قریب اور علم وعمل میں زیادہ پختہ ہے۔''

(الموافقات للشاطبی : ۷۷/۳)

② حافظ ابنِ عبدالہادی رحمہ اللہ (۷۰۴۔۷۴۴ھ) لکھتے ہیں:

ولا يـجـوز إحـداث تـأويـل فى آية أو سنّة لم يكن على عهد السلف ، ولا عرفوه ولا بيّـنـوه لـلأمّة ، فـإنّ هـذا يتـضـمّن أنّهم جهلوا الحقّ فى هذا ، وضلّوا عنه ، واهتدى إليه هذا الـمعتـرض المتأخّر . ''کسی آیت یا حدیث کا ایسا مفہوم ومطلب نکالنا جائز نہیں، جو سلف کے زمانہ میں نہ تھا، نہ انہوں نے اسے پہچانا اور نہ امت کے لیے بیان کیا۔ اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ وہ اس بارے میں حق سے جاہل رہے ہیں اور اس سے گمراہ رہے ہیں اور یہ اعتراض کرنے والا، بعد والا شخص اس کی طرف راہ پا گیا ہے۔''

(الصارم المنكى فى الرد على السبكى لابن عبد الهادى : ص ۳۱۸)

③ سنی امام ، ابوبکر محمد بن القاسم بن بشار ، المعروف بابن الانباری رحمہ اللہ (۲۷۲۔۳۲۸ھ) فرماتے ہیں: مـن قال فى القرآن قولا يوافق هواه ، لم يأخذ عن أئـمّة السلف ، فأصاب ، فقد أخطأ ، لحكمه على القرآن بما لا يعرف أصله ، ولا يقف على مذهب أهل الأثر والنقل فيه .

''جس شخص نے قرآنِ کریم کی تفسیر میں اپنی خواہش کے موافق ایسا قول کہا، جسے اس نے ائمہ سلف سے اخذ نہیں کیا، اگر وہ درست ہے تو بھی غلط ہے، کیونکہ اس نے قرآنِ کریم پر ایسا حکم لگایا ہے، جس کی وہ دلیل نہیں جانتا تھا اور نہ ہی وہ اس بارے میں اہل اثر ونقل (سلف صالحین) کے مذہب پر واقف ہوا ہے۔'' (الفقيه والمتفقه للخطيب البغدادى : ۲۲۳/۱، وسندهٗ صحيحٌ)

④ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ (۶۹۱۔۷۵۱ھ) لکھتے ہیں:

إنّ إحـداث قول فى تفسير كتاب الله الذى كان السلف والأئمّة على خلافه يستلزم أحـد الأمـريـن ، إمّا أن يكون خطأ فى نفسه ، أو تكون أقوال السلف المخالفة له خطأ ، ولا يشكّ عاقل أنّه أولى بالغلط والخطأ من قول السلف . ''کتاب اللہ کی تفسیر میں کوئی ایسا

قول نکالنا کہ سلف اور ائمہ دین اس کے خلاف تھے، اس کی دو صورتیں بن سکتی ہیں، یا تو خود غلط ہوگا یا پھر اس کے خلاف سلف کے اقوال غلط ہوں گے۔ کوئی عاقل اس بات میں شک نہیں کر سکتا کہ سلف کے اقوال کی نسبت وہ قول خود غلطی اور خطا کے زیادہ لائق ہے۔'' (مختصر الصواعق المرسلة لابن القیم : ۱۲۸/۲)

ثابت ہوا کہ اہل بدعت عقائد واعمال میں جو سلف صالحین کی مخالفت کرتے ہیں ، ان کی ضلالت وجہالت کے لیے اتنا ہی کافی ہے، لہٰذا مبتدعین اپنے شرکیہ عقائد و بدعیہ اعمال پر جو قرآن وحدیث کے دلائل سے سلف کے خلاف استدلال کرتے ہیں، اس سے ان کی ضلالت وجہالت پر مہر ثبت ہو جاتی ہے۔

یاد رہے کہ سلف صالحین وائمہ اہل سنت کے خلاف عقائد واعمال رکھنے والے اہل سنت والجماعت کہلوانے کا کوئی حق نہیں رکھتے۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر گیارہویں کا کوئی شرعی ثبوت یا جواز ہوتا تو سلف صالحین اور ائمہ اہل سنت کرنے میں پہل کرتے۔ اگر انہوں نے یہ کام نہیں کیا تو یہ باطل ہے۔

علامہ شاطبی رحمہ اللہ (م۷۹۰ھ) لکھتے ہیں: **فالحذر الحذر من مخالفة الأوّلين ، فلو كان ثمّ فضل ما ، لكان الأوّلون أحقّ به ، والله المستعان !**

''پہلے سلف کی مخالفت سے بہت زیادہ بچنا چاہیے۔ اگر اس کام (جس کو سلف نے نہیں کیا) میں کوئی فضیلت ہوتی تو پہلے لوگ اس کے زیادہ مستحق تھے، واللہ المستعان!''

(الموافقات للشاطبی : ۵٦/۳)

گیارہویں بدعت ہے!

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ (٦٦١۔۷۲۸ھ) لکھتے ہیں: **ومن تعبّد لعبادة ليست واجبة ولا مستحبّة ، وهو يعتقدها واجبة أو مستحبّة ، فهو ضالّ مبتدع بدعة سيّئة ، لا بدعة حسنة ، باتّفاق أئمّة الدين ، فإنّ اللّه لا يعبد إلّا بما هو واجب أو مستحبّ .**

''جو شخص ایسی عبادت کرے جو شریعت میں واجب یا مستحب نہیں ہے اور وہ اس کو واجب یا مستحب سمجھتا ہے، وہ گمراہ بدعتی ہے، اس کی یہ بدعت سیئہ ہے، حسنہ نہیں ہے۔ اس پر ائمہ دین کا اتفاق ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت صرف اسی طریقے سے کی جائے گی، جو شریعت میں واجب یا مستحب ہے۔'' (مجموع الفتاوی لابن تیمیة : ۱٦۰/۱)

علامہ شاطبی رحمہ اللہ (م۷۹۰ھ) لکھتے ہیں: **فی کثیر من الأمور یستحسنون أشیاء ، لم یأت فی کتاب و لا سنّة و لا عمل بأمثالها السلف الصالح ، فیعملون بمقتضاها ویثابرون علیها ، ویحکّمونها طریقا لهم مهیعا وسنّة لا تخلف ، بل ربّما أوجبوها فی بعض الأحوال .**

''بدعتی لوگ بہت سے امور میں ان کاموں کو مستحب قرار دے دیتے ہیں، جن پر کتاب وسنت میں کوئی دلیل نہیں، نہ ہی سلف صالحین نے اس طرح کا کوئی کام کیا ہے۔ بدعتی لوگ اس طرح کے کام کرتے ہیں، ان پر دوام کرتے ہیں اور اس بدعت کو اپنے لیے واضح راستہ اور غیر معارض سنت سمجھتے ہیں، بلکہ بسا اوقات وہ اس کو بعض حالات میں واجب بھی قرار دیتے ہیں۔'' (الاعتصام : ۲۱۲/۱)

امام ابن ابی العز الحنفی (۷۳۱۔۷۹۲ھ) لکھتے ہیں: **وصاروا یبتدعون من الدلائل والمسائل ما لیس بمشروع ، ویعرضون عن الأمر المشروع .**

''بدعتی لوگ ایسے دلائل ومسائل گھڑنے کے درپے ہیں، جن کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں اور وہ مشروع کام سے اعراض کرتے ہیں۔''

(شرح العقیدة الطحاویة لابن ابی العز الحنفی : ۵۹۳)

گیارہویں قربِ الٰہی کا ذریعہ نہیں!

گیارہویں اگر قربِ الٰہی کا ذریعہ ہوتی تو ائمہ اہل سنت ضرور ایسا کرتے۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ (۶۶۱۔۷۲۸ھ) لکھتے ہیں: **باب العبادات والدیانات والتقرّبات متلقّاة عن اللّٰہ ورسوله ، فلیس لأحد أن یجعل شیئا عبادة أو قربة إلّا بدلیل شرعیّ .** ''عبادات، دین کے مسائل اور قربِ الٰہی کے کام اللہ ورسول سے ہی لیے جاتے ہیں۔ کسی اور کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ دلیلِ شرعی کے بغیر کوئی عبادت یا قربِ الٰہی کا کوئی طریقہ گھڑ لے۔'' (مجموع الفتاوی لابن تیمیة : ۳۱ /۳۵)

اگر گیارہویں کے ثبوت پر کوئی شرعی دلیل ہوتی تو سلف صالحین ضرور اس کا اہتمام کرتے، لہٰذا یہ بے ثبوت عمل ہے، جو قربِ الٰہی کا ذریعہ نہیں ہے۔

امام ابنِ قیم رحمہ اللہ (۶۹۱۔۷۵۱ھ) لکھتے ہیں: **ولا دین إلّا ما شرعه اللّٰه ، فالأصل فی**

العبادات البطلان حتى يقوم دليل على الأمر .

''دین صرف وہی ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے مشروع قرار دیا ہے۔عبادات میں قاعدہ یہ ہے کہ جب تک کسی دینی امر پر دلیلِ شرعی قائم نہ ہوجائے، وہ باطل ہے۔''

(اعلام الموقعين لابن القيم : ٣٤٤/١)

حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ (۷۰۰۔۷۷۴ھ) عبادات کے متعلق لکھتے ہیں:

وباب القربات يقتصر فيه على النصوص ، ولا ينصرف فيه بأنواع الأقيسة والآراء .

''قربِ الٰہی کے کام نصوصِ شرعیہ پر موقوف ہیں۔ان میں کسی قسم کے قیاس وآراء کا کوئی عمل دخل نہیں۔''(تفسير ابن كثير : ٤ /٤٠١)

علامہ شاطبی رحمہ اللہ (م۷۹۰ھ) لکھتے ہیں: ''**لا تجد مبتدعا ممّن ينسب إلى الملّة إلّا وهو يستشهد على بدعته بدليل شرعيّ ، فينزله على ما وافق عقله وشهوته .**''

آپ اسلام کی طرف منسوب ہر بدعتی کو ایسا ہی پائیں گے کہ وہ اپنی بدعت پر دلیلِ شرعی سے استدلال کرتا ہے، پھر اس کو اپنی عقل وخواہش کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔''(الاعتصام للشاطبی : ١ /١٣٤)

گیارہویں کے بدعت ہونے پر ایک دوسری دلیل

یادرہے کہ عبادات کے لیے وقت یا جگہ کا تعین کرنا شریعت کا حق ہے، بندوں کو کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ عبادات کے لیے جگہ یا وقت کا تقرر کرتے رہیں۔سلف صالحین نے سختی سے اس کارد کیا ہے، لہٰذا خاص شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے لیے صدقہ کرنا اور خاص گیارہویں تاریخ کو، یہ اسے ناجائز اور غیر مشروع بنا دیتا ہے۔

علامہ شاطبی رحمہ اللہ (م۷۹۰ھ) لکھتے ہیں: **ومن ذلك تخصيص الأيّام الفاضلة بأنواع من العبادات التى لم تشرع بها تخصيصا كتخصيص اليوم الفلانى بكذا وكذا من الركعات أو بصدقة كذا وكذا ، أو الليلة الفلانيّة بقيام كذا وكذا ركعة أو بختم القرآن فيها أو ما أشبه ذلك .**

''عام دنوں کو ان عبادات کے ساتھ خاص کرنا، جو ان دنوں میں مشروع نہیں ہیں، جیسا کہ کسی دن کو خاص عدد رکعات یا خاص صدقہ کے ساتھ خاص کرنا یا فلاں رات کو اتنی اتنی رکعات پڑھنا یا خاص رات میں

قرآنِ کریم مکمل کرنا وغیرہ۔''(الاعتصام للشاطبی : ۱۲/۲)

علامہ ابوشامہ (۵۹۹۔۶۶۵ھ) لکھتے ہیں:

ولا ینبغی تخصیص العبادات بأوقات لم یخصصها بها الشرع ، بل یکون جمیع أفعال البرّ مرسلة فی جمیع الأزمان ، لیس لبعضها علی بعض فضل إلّا ما فضّله الشرع ، وخصّه بنوع من العبادة ، فإن کان ذلک اختصّ بتلک الفضیلة تلک العبادة دون غیرها کصوم یوم عرفة وعاشوراء والصلاة فی جوف اللیل والعمرة فی رمضان ، ومن الأزمان ما جعله الشرع مفضّلا فیه جمیع أعمال البرّ کعشر ذی الحجّة ولیلة القدر التی هی خیر من ألف شهر ، أی العمل فیها أفضل من العمل فی ألف شهر ، لیس فیها لیلة القدر ، فمثل ذلک یکون أیّ عمل من اعمال البرّ حصل فیها کان له الفضل علی نظیره فی زمن آخر ، فالحاصل أنّ المکلّف لیس له منصب التخصیص ، بل ذلک إلی الشارع ، وهذه کانت صفة عبادة رسول اللّٰه صلّی اللّٰه علیه وسلّم .

''عبادات کو ان اوقات کے ساتھ خاص کرنا جائز نہیں ، جن اوقات کے ساتھ ان کو شریعت نے خاص نہیں کیا ، بلکہ تمام نیکی کے کام تمام زمانوں میں جائز ہیں ۔ کسی کام کو تخصیص میں کسی پر فضیلت نہیں ہے ، مگر اس کو جسے شریعت نے فضیلت دی ہے اور کسی قسم کی عبادت کے ساتھ خاص کیا ہے ۔ اگر کسی فضیلت کو کسی کام کے ساتھ خاص کر دیا گیا تو وہ عبادت ہے ، جیسا کہ یومِ عرفہ و عاشوراء کا روزہ ، آخری رات کی عبادت اور رمضان میں عمرہ ، دوسرے کام عبادت نہیں بن سکتے ۔ اور بعض اوقات وہ ہیں ، جن میں انسانوں کے تمام اعمال کو فضیلت دے دی جاتی ہے ، جیسا کہ ذی الحجہ کے دس دن اور وہ لیلۃ القدر ، جو ہزار سال سے بہتر ہے ، یعنی اس رات میں عمل کرنا ایسے ہزار سال میں عمل کرنے سے بہتر ہے ، جن میں لیلۃ القدر نہ ہو ۔ اس طرح ہر وہ نیکی کا کام ہے ، جس میں خاص فضیلت مقرر کر دی گئی ہو ، اس کو دوسرے وقت میں اپنے جیسے نیکی کے کام پر فضیلت ہو گی ۔ حاصل کلام یہ ہے کہ مکلّف (امتی) کے لیے تخصیص کا منصب نہیں ہے ، بلکہ تخصیص کا معاملہ شارع کی طرف لوٹتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کی عبادت کا انداز یہی تھا ۔''

(الباعث علی انکار البدع والحوادث لابی شامة : ص ۱۶۵)

الحاصل: گیارہویں بدعت ہے ۔ سلف صالحین سے صدقہ کی یہ ہیئت و کیفیت ثابت نہیں ۔

زمین کو ٹھیکے پر دینے کا شرعی جواز

حافظ ابو یحییٰ نورپوری

دنیاوی معاملات میں چونکہ اصل اباحت ہے اور حرمت کے ثبوت کا کسی صحیح وصریح دلیل کا محتاج ہوتا ہے، لہٰذا اس اصول کے تحت زمین کو کرایہ، یعنی ٹھیکہ پر دینا بالکل جائز و درست ہے۔ اس کے خلاف کوئی دلیل نہیں۔

رہا سیدنا رافع بن خدیج اور دوسرے کئی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زمین کو ٹھیکے پر دینے کی ممانعت کرنا تو اس سے مراد حرمت نہیں، بلکہ محض نرمی کی ہدایت ہے۔ اگر کوئی خود زمین کاشت نہیں کرتا تو کسی دوسرے مسلمان کو بغیر عوض کے زمین دے دینا اس کے لیے بہتر اور کارِ ثواب ہے۔ رہا ٹھیکے پر دینے کا عمل تو اس میں سے صرف ظلم وزیادتی والی صورتوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ممنوع قرار دیا ہے، ہر طرح کے ٹھیکے کو نہیں، کیونکہ:

① اس ممانعت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرنے والے صحابیٔ رسول سیدنا رافع بن خدیج خود خالی زمین کو کرائے پر دینے کے قائل تھے۔ چنانچہ حنظلہ بن قیس رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں: **سألت رافع بن خديج عن كراء الأرض بالذهب والورق ، فقال : لا بأس به ، إنّما كان الناس يؤاجرون على عهد النبيّ صلّى الله عليه وسلّم على الماذيانات ، وأقبال الجداول ، وأشياء من الزرع ، فيهلك هذا ويسلم هذا ، ويسلم هذا ويهلك هذا ، فلم يكن للناس كراء إلّا هذا ، فلذلك زجر عنه ، فأمّا شيء معلوم مضمون ، فلا بأس به .** ''میں نے سیدنا رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے زمین کو سونے، چاندی (نقدی) کے عوض کرائے پر دینے کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا، اس میں کوئی حرج نہیں۔ (رہی بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منع فرمانے کی تو اصل

بات یہ ہے کہ) نبیٔ اکرم ﷺ کے عہدِ مبارک میں لوگ ٹھیکے پر زمین اس شرط پر دیتے تھے کہ پانی کے قریب والی زمین، نالوں کے کناروں پر واقع زمین اور کئی طرح کا (متعین) غلہ ان کا ہو گا۔اس صورت میں کبھی یہ ہلاک ہو جاتا (نقصان اٹھاتا) اور وہ سلامت رہ جاتا (نفع مند رہتا) اور کبھی یہ سلامت رہ جاتا اور وہ ہلاک ہو جاتا۔ان دنوں میں لوگوں کے پاس زمین کو ٹھیکے پر دینے کی صرف یہی صورت تھی،اس لیے نبیٔ اکرم ﷺ نے اس سے منع فرما دیا۔رہا ٹھیکے کا وہ معاملہ جو معلوم و متعین ہو (نقدی کی صورت میں ہو) تو اس میں کوئی حرج نہیں۔''

(صحیح البخاری : ٢٣٤٦، صحیح مسلم : ١٥٤٧/ ١١٦، واللفظ له)

صحیح مسلم (١٥٤٧/ ١١٧) کی ایک روایت کے یہ الفاظ ہیں:

كنّا أكثر الأنصار حقلا ، قال : كنّا نكرى الأرض على أنّ لنا هذه ، ولهم هذه ، فربما أخرجت هذه ، ولم تخرج هذه ، فنهانا عن ذلک ، وأمّا الورق فلم ينهنا . ''ہم سب انصار سے بڑھ کر کاشتکاری کرنے والے تھے۔ہم زمین کو اس شرط پر ٹھیکے پر حاصل کرتے تھے کہ زمین کا یہ حصہ ہمارے لیے اور یہ حصہ ان (مالکوں) کے لیے ہے۔بسا اوقات ایسے ہوتا کہ زمین کا ایک خطہ اچھا غلہ اگاتا اور دوسرا خطہ غلہ نہ اگاتا۔اس طریقے سے ہمیں رسول اللہ ﷺ نے منع فرما دیا۔رہی چاندی (نقدی کے عوض ٹھیکے کا معاملہ کرنا) تو اس سے آپ ﷺ نے ہمیں منع نہیں فرمایا۔''

صحیح بخاری کی ایک روایت میں سیدنا رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ یوں بیان فرماتے ہیں:

وأمّا الذهب والورق ، فلم يكن يومئذ .

''رہا سونے اور چاندی کے عوض ٹھیکے کا معاملہ تو یہ ان دنوں میں تھا ہی نہیں، جب رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا تھا۔''(صحیح البخاری : ٢٣٢٧)

امام بغوی رحمہ اللہ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

فيه دليل على جواز إجارة الأراضى ، وذهب عامّة أهل العلم إلى جوازها

بالدراهم والدنانيز ، وغيرها من صنوف الأموال ، سواء كانت ممّا تنبت الأرض ، أو لا تنبت ، إذا كان معلوما بالعيان ، أو بالوصف ، كما يجوز إجارة غير الأراضي من العبيد والدوابّ وغيرها ، وجملته أنّ ما جاز بيعه ، جاز أن يجعل أجرة في الإجارة . ''اس حدیث میں زمین کو ٹھیکے پر لینے دینے کی دلیل ہے۔اکثر اہل علم سونے ، چاندی (نقدی) اور مال کی دوسری اقسام کے عوض زمین کے ٹھیکے کے جواز کے قائل ہیں، خواہ وہ چیز زمین سے اگتی ہو یا نہ اگتی ہو، بشرطیکہ اس کی مقدار اور کیفیت معلوم ہو۔یہ (زمین کا کرایہ پر لینا دینا) اسی طرح جائز ہے، جیسے زمین کے علاوہ دوسری چیزیں، مثلاً غلام، جانور وغیرہ کو کرائے پر لینا دینا جائز ہے۔خلاصہ یہ کہ جس چیز کی خرید وفروخت جائز ہے، اس کو اجرت کے بدلے کرائے پر لینا دینا بھی جائز ہے۔۔۔'' (شرح السنة للبغوی : ۲۶۳/۸)

شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں :

وذهب جميع فقهاء الحديث الجامعون لطرقه كلّهم ، كأحمد بن حنبل وأصحابه كلّهم من المتقدّمين ، والمتأخّرين ، وإسحاق بن راهويه ، وأبي بكر بن أبي شيبة ، وسليمان بن داود الهاشميّ ، وأبي خيثمة زهير بن حرب ، وأكثر فقهاء الكوفيّين ، كسفيان الثوري ، ومحمّد بن عبد الرحمن بن أبي ليلى ، وأبي يوسف ، ومحمّد صاحبي أبي حنيفة ، والبخاريّ صاحب الصحيح ، وأبي داوٗد ، وجماهير فقهاء الحديث من المتأخّرين : كابن المنذر ، وابن خزيمة ، والخطّابيّ ، وغيرهم ، وأهل الظاهر ، وأكثر أصحاب أبي حنيفة إلى جواز المزارعة والمؤاجرة ونحو ذلك اتّباعا لسنّة رسول اللّٰه صلّى اللّٰه عليه وسلّم وسنّة خلفائه وأصحابه وما عليه السلف وعمل جمهور المسلمين .

''سنتِ رسول، خلفائے راشدین اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل، سلف صالحین اور اکثر مسلمانوں کی روش کی پیروی میں اس حدیث کی ساری روایات کو جمع کرنے والے فقہائے

حدیث، مثلاً امام احمد بن حنبل، آپ رحمہ اللہ کے تمام متقدمین ومتاخرین اصحاب، امام اسحاق بن راہویہ، امام ابوبکر بن ابی شیبہ، امام سلیمان بن داوٗد ہاشمی، امام ابوخیثمہ زہیر بن حرب، اکثر فقہائے کوفہ، جیسا کہ امام سفیان ثوری، محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ، امام ابوحنیفہ کے دونوں شاگرد ابو یوسف ومحمد، امام بخاری، امام ابوداوٗد اور جمہور متاخرین فقہائے حدیث، مثلاً امام ابنِ منذر، امام ابنِ خزیمہ، خطابی اور اہل ظاہر، امام ابوحنیفہ کے اکثر پیروکاروں کا مذہب ہے کہ مزارعت اور ٹھیکہ وغیرہ جائز ہے۔۔۔''

(مجموع الفتاوی لابن تیمیة : ۲۹/۹۴۔۹۵، القواعد النورانیة الفقهیة : ۱٦۳)

شیخ الاسلام ثانی، عالم ربانی، امام ابن القیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وقال ابن المنذر : قد جائت الأخبار عن رافع بعلل ، تدلّ علی أنّ النهی کان بتلک العلل . ''سیدنا رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ سے آنے والی (ٹھیکے کی ممانعت والی) روایات میں کئی وجوہات بیان ہوئی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ٹھیکے کی ممانعت انہی وجوہات کی وجہ سے تھی (مطلق طور پر ٹھیکے کا معاملہ حرام نہ تھا)۔''

(حاشیة ابن القیم علی سنن ابی داوٗد : ۹/۱۸٦)

نیز لکھتے ہیں: **المخابرة التی نهاهم عنها رسول الله صلّی الله علیه و سلّم هی التی کانوا یفعلونها من المخابرة الظالمة الجائرة ، وهی التی جائت مفسّرة فی أحادیثهم .** ''زمین کے جس معاملے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے، وہ اس معاملے کی وہ صورتیں ہیں، جو ظلم وزیادتی پر مبنی تھیں، ان کی وضاحت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی بیان کردہ احادیث میں آ گئی ہے۔۔۔''(حاشیة ابن القیم علی سنن ابی داوٗد : ۹/۱۹۳)

امام ابن دقیق العید رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

فیه دلیل علی جواز کراء الأرض بالذهب والورق ، وقد جاء ت أحادیث مطلقة فی النهی عن کرائها ، وهذا مفسّر لذلک الإطلاق ...

''اس حدیث میں زمین کو سونے ، چاندی (نقدی) کے عوض ٹھیکے پر لینے دینے کا جواز موجود ہے۔ کچھ مطلق احادیث زمین کے ٹھیکے سے ممانعت کے بارے میں آئی ہیں، یہ حدیث اس اطلاق کی تفسیر وتقیید کرتی ہے (یعنی بتاتی ہے کہ ہر ٹھیکہ نا جائز نہیں)۔۔۔''

(احکام الأحکام شرح عمدة الاحکام لابن دقیق العید : ص ۳۸۰)

معلوم ہوا کہ ٹھیکے کی غلط صورتوں سے نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا تھا، نہ کہ مطلق ٹھیکے سے، کیونکہ خود راویٔ حدیث سیدنا رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ نے وضاحت فرما دی ہے کہ انصار ٹھیکے کے وقت جگہ مقرر کر لیتے تھے کہ زمین کے اس ٹکڑے کی پیداوار ٹھیکے والے کو اور اس ٹکڑے کی مالک کو ملے گی، یوں کبھی ٹھیکے والے کو نقصان ہو جاتا اور کبھی مالک کو۔ اسی طرح کبھی معاملہ یوں طے پاتا کہ زمین سے پیداوار کم ہو یا زیادہ، مالک نے مقررہ مقدار غلہ لینا ہے۔ اس صورت میں بھی ایک فریق کو نقصان کا خدشہ ہوتا تھا، اس لیے اسے بھی شریعت نے ممنوع ٹھہرایا۔ رہی نقدی کے عوض ٹھیکے کی صورت تو یہ اس دور میں تھی ہی نہیں، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے، لہٰذا یہ ممنوع کیسے ہو سکتی ہے؟ فقہائے کرام اور محدثین عظام کا فہم بھی یہی ہے۔ اس بارے میں ایک حدیثِ رسول بھی ملاحظہ فرمائیں:

② سیدنا رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إنّما یزرع ثلاثة : رجل منح أرضا فھو یزرع ما منح ، ورجل له أرض فھو یزرعھا ، ورجل استکریٰ أرضا بذھب أو فضة .

''تین آدمی ہی زمین کاشت کرنے کے اہل ہیں، ایک وہ جس کو کوئی زمین تحفۃً دے دی گئی ہو اور وہ اس میں کاشت کرے اور دوسرا وہ شخص، جس کے پاس اپنی زمین ہو اور وہ اس میں کاشت کرے اور تیسرا وہ شخص، جو زمین کو سونے، چاندی (نقدی) کے عوض ٹھیکے پر حاصل کرتا ہے اور اس میں کاشت کرتا ہے۔''

(سنن النسائی : ۳۸۹۰، مصنف ابن ابی شیبة : ۷ /۸۵، ح : ۲۲۸۷۲، السنن الکبریٰ للنسائی :

٤٦١٧، سنن الدارقطنی : ٣ /٩٦، ح : ١٤٥، وسندہٗ حسنٌ)

یہ حدیث ممانعت والی احادیث کے مطلق نہ ہونے پر دلالت کرتی ہے اور صراحت سے بتاتی ہے کہ نقدی کے عوض زمین کے ٹھیکے کا معاملہ بالکل جائز و درست ہے۔

③ سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

یغفر اللّٰہ لرافع بن خدیج ! أنا واللّٰہ أعلم بالحدیث منه ، إنّما أتی رجلان قد اقتتلا ، فقال رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیه وسلّم ، إن کان ھذا شأنکم فلا تکروا المزارع ، قال فسمع رافع قوله : لا تکروا المزارع .

''اللہ تعالیٰ رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کو معاف فرمائے۔ میں اس (زمین کے ٹھیکے کی ممانعت والی) حدیث کو ان سے بہتر جانتا ہوں۔ دراصل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دو آدمی آئے، جو (ٹھیکے والے معاملے میں) لڑ پڑے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اگر تمہاری یہی صورتِ حال ہے تو پھر زمینوں میں ٹھیکے کا معاملہ نہ کیا کرو۔ سیدنا رافع رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتنا فرمان ہی سنا تھا کہ زمینوں میں ٹھیکے کا معاملہ نہ کیا کرو (ممانعت کی وجہ نہیں سن سکے)۔''

(مسند الامام احمد : ٥ /١٨٧، سنن ابی داوٗد : ٣٣٩٠، سنن ابن ماجہ : ٢٤٦١، سنن النسائی : ٣٩٢٧، السنن الکبریٰ للبیہقی : ٣ /١٠٦، وسندہٗ حسنٌ)

سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ یہ خیال کرتے تھے کہ سیدنا رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ زمین کے کرائے والی حدیث میں ممانعت کو مطلق سمجھتے ہیں اور ان کے نزدیک ہر طرح کا ٹھیکہ ناجائز ہے، اسی لیے ان سے حدیث سن کر سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ٹھیکے کو ترک کر دیا تھا، لیکن ہم پیچھے ذکر کر چکے ہیں کہ سیدنا رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ بھی اس حدیث کی ممانعت کو ظلم و زیادتی والی صورتوں کے ساتھ خاص سمجھتے تھے، نقدی کے عوض زمین کے ٹھیکے کو وہ بھی جائز سمجھتے تھے۔ معلوم ہوا کہ سیدنا زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے نزدیک بھی یہ حدیث مطلق نہیں اور ہر طرح کا ٹھیکہ ناجائز نہیں۔

④ سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں:

كنت أعلم في عهد النبيّ صلّى الله عليه وسلّم أنّ الأرض تكرى ، ثمّ خشي عبد الله أن يكون النبيّ صلّى الله عليه وسلّم قد أحدث في ذلك شيئا لم يكن يعلمه ، فترك كراء الأرض . ''میں جانتا ہوں کہ نبی ٔاکرم ﷺ کے عہدِ مبارک میں زمین ٹھیکے پر لی دی جاتی تھی ۔ (سالم بن عبداللہ بن عمر بیان کرتے ہیں کہ) پھر سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما (سیدنا رافع بن خدیج کی حدیث سن کر) اس بات سے ڈر گئے کہ شاید اس بارے میں نبیٔ اکرم ﷺ نے کوئی نیا حکم جاری کر دیا ہو، لہٰذا انہوں نے زمین کے ٹھیکے کا معاملہ چھوڑ دیا۔'' (صحيح البخاري : ٢٣٤٥، صحيح مسلم : ١٥٤٧ /١٢٢)

معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے عہدِ مبارک میں زمین کے ٹھیکے کا معاملہ ہوتا تھا اور آپ ﷺ کے آخری عہد تک ہوتا رہا، سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما آپ ﷺ کی زندگی کے بعد بھی یہ معاملہ کرتے رہے، لیکن جب سیدنا رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ کی حدیث ان تک پہنچی تو انہوں نے اسے مطلق سمجھ کر ٹھیکہ کو چھوڑ دیا، حالانکہ یہ بات بالصراحت گزر چکی ہے کہ اس سے مطلق ممانعت مراد نہیں تھی، بلکہ صرف کچھ خرابی والی صورتوں سے منع کیا گیا تھا۔

⑤ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

إنّ أمثل ما أنتم صانعون تستأجروا الأرض البيضاء بالذهب والورق .

''سب سے بہترین صورت یہ ہے کہ تم خالی زمین کو سونے ، چاندی (نقدی) کے عوض کرائے (ٹھیکے) پر حاصل کرو۔'' (مصنف ابن ابي شيبة : ٧/ ٨٧، مصنف عبد الرزاق : ٤/ ٤٩٢، السنن الكبرٰى للبيهقي : ٦/١٣٣، صحيح البخاري : قبل ٢٣٤٦، تعليقا ، وسندهٔ صحيحٌ)

⑥ امام ابنِ شہاب زہری رحمہ اللہ نے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے صاحبزادے امام سالم رحمہ اللہ سے زمین کو نقدی کے عوض ٹھیکے پر لینے دینے کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے فرمایا: **لا بأس بها بالذهب والورق .** ''سونے، چاندی (نقدی) کے عوض ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں۔'' (الموطا للامام مالك : ١٣٩٢، وسندهٔ صحيحٌ)

⑦ امام ابنِ شہاب زہری رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

''میں نے امام سعید بن مسیّب تابعی سے زمین کو سونے، چاندی (نقدی) کے عوض کرائے پر دینے کے بارے میں سوال کیا تو آپ فرمایا، اس میں کوئی حرج نہیں۔''

(الموطا للامام مالك : ١٣٩١، وسندهٗ صحيحٌ)

⑧ امام عبیداللہ بن عمر العمری رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

''امام سالم بن عبداللہ بن عمر، امام سعید بن مسیّب، امام عروہ بن زبیر اور امام زہری رحمہم اللہ سب زمین کو سونے، چاندی (نقدی) کے عوض ٹھیکے پر لینے دینے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔'' (مصنف ابن ابی شیبة : ٢٢٨٧٧، وسندهٗ صحيحٌ)

⑨ حجاج بن دینار، امام محمد بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب، المعروف ابوجعفر الباقر رحمہ اللہ کے بارے میں بیان کرتے ہیں: ''میں نے امام ابوجعفر الباقر رحمہ اللہ سے ایسی خالی زمین کے بارے میں پوچھا، جس میں کوئی درخت اور کھیتی نہ ہو، کیا ہم اسے درہم و دینار کے عوض کرائے پر حاصل کر سکتے ہیں؟ آپ رحمہ اللہ نے فرمایا، یہ بہت اچھا کام ہے، ہم مدینہ میں اس طرح کرتے ہیں۔'' (مصنف ابن ابی شیبة : ٢٢٨٨١، وسندهٗ حسنٌ)

⑩ معاویہ بن ابی اسحاق بیان کرتے ہیں: **سألت سعيد بن جبير عن إجارة الأرض ، فقال : لا بأس بها .** ''میں نے امام سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے زمین کو ٹھیکے پر لینے کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے فرمایا، اس میں کوئی حرج نہیں۔''

(مصنف ابن ابی شیبة : ٢٢٨٨٤، وسندهٗ حسنٌ)

الحاصل : نقدی کے عوض زمین کے ٹھیکے کا معاملہ بالکل درست ہے، اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔ حدیثِ رسول، فہمِ صحابہ، عملِ تابعین اور جمہور امت کے تعامل سے یہی ثابت ہوتا ہے۔

صحیح بخاری کا مطالعہ اور فتنۂ انکارِ حدیث

حافظ ابو یحییٰ نور پوری

عقلی اعتراض

جب اس حدیث کی سند میں کوئی قابل التفات اعتراض نہیں ہے تو پھر اس پر عقلی اعتراضات کرنا تو بالکل اسی طرح ہے، جیسے بعض ناعاقبت اندیش لوگ قرآنِ کریم پر اعتراضات کر دیتے ہیں۔ اس سے نہ قرآنِ کریم کی صحت پر کچھ اثر پڑتا ہے اور نہ حدیثِ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی صحت مشکوک ہوتی ہے۔

آیئے ان کے اس "عقلی" اعتراض کا علمی و تحقیقی جائزہ لیں۔ میرٹھی صاحب لکھتے ہیں:

"میں کہتا ہوں کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نہایت ذہین و فہیم اور حافظِ قرآن و کاتبِ وحی صحابی تھے۔ یقیناً یہ نامعقول اور قطعاً غلط بات انہوں نے نہیں کہی، کیونکہ المنافقین سے اس آیت میں عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کو جو جنگِ اُحد کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی مدینہ سے نکلے تھے اور راستہ سے ہی واپس ہو گئے تھے، یہ کہہ کر کہ لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنَاكُمْ اور اپنے اسی عملِ شنیع سے انہوں نے باقی ماندہ سات سو مسلمانوں میں پست ہمتی پیدا کرنی چاہی تھی، وہی بے وقوف شخص مراد سمجھ سکتا ہے، جس کے علم و حفظ میں بعد کی آیت نہ ہو۔ بعد کی آیت یہ ہے۔۔۔یعنی ان منافقین کی آرزو ہے کہ تم بھی کافر ہو جاؤ، جیسے وہ کافر ہو گئے۔ اس طرح تم سب برابر ہو جاؤ۔۔۔لہٰذا تم اہل ایمان ان میں سے دوست نہ بنانا یہاں تک کہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کریں۔۔۔

لفظ حتی یھاجروا فی سبیل اللّٰہ بانگِ دہل اعلان کر رہا ہے کہ ذکر مدینہ میں رہنے والے منافقین عبداللہ بن ابی کے ساتھیوں کا نہیں، جو جنگِ اُحد کے موقع پر مدینہ واپس

ہو گئے تھے اور پورا رکوع مطالعہ کر جائیے تو قطعاً واضح ہو جائے گا کہ فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنَافِقِينَ فِئَتَيْنِ میں منافقین سے مراد وہ لوگ ہیں، جو مدینہ سے باہر مختلف قبائل میں سے مسلمان ہو گئے تھے۔ ان سے کہا گیا تھا کہ ہجرت کر کے مدینہ آ جاؤ تا کہ اسلام کو اچھی طرح سمجھ سکو، قرآن کو یاد کر سکو اور صحیح معنوں میں اسلامی زندگی گزارنا جان جاؤ، مگر ان نومسلم لوگوں نے اس حکم کی قصداً تعمیل نہ کی اور یہ خیال کر کے ہجرت سے باز رہے کہ مدینہ پہنچ کر کیا کریں گے، کیا کھائیں گے، کیا پئیں گے؟

سیاسی و جنگی ضرورت کے تحت ان قبائل کو سزا دینے کی ضرورت بھی، جن میں اس طرح کے اِکّا دُکّا نام نہاد مسلمان تھے۔ ان مسلمانوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے، ہجرت نہ کرنے کی وجہ سے وہ بھی پورے قبیلہ کی طرح محلِّ قتل و قتال ہیں اور ان کا اسلام غیر معتبر ہے یا انہیں مسلمان سمجھا جائے اور ان سے جنگ کرنے اور انہیں قتل کرنے سے گریز کیا جائے! کچھ مسلمانوں کا خیال وہ تھا اور کچھ کا یہ۔ انہیں کے متعلق فرمایا کہ ایسے نام نہاد مسلمانوں کو اپنا نہ سمجھو اور تم سب بہ اتفاقِ رائے انہیں گمراہ و کشتنی ہی مانو۔۔۔ یہ غلط روایت عدی بن ثابت کی ساختہ پرداختہ ہے۔ راویانِ حدیث کو قرآن یاد کرنے، اسے سمجھنے اور اس میں غور و تدبر کرنے کی فرصت ہی نہ تھی۔ امام بخاری نے آیت فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنَافِقِينَ فِئَتَيْنِ کو بعد کی آیات کے ساتھ ملا کر پڑھا اور سمجھا ہوتا تو زید بن ثابت کی طرف منسوب اس حدیث کو ہرگز درجِ صحیح نہ فرماتے۔''

(««صحیح بخاری کا مطالعہ»» : ۸۵۔۸۷)

جواب : ① سب سے پہلے تو ہم میرٹھی صاحب کی سب سے آخری بات کا جواب دیتے ہیں۔ عدی بن ثابت کے بارے میں تو قارئین کرام مزید کسی تفصیل کے محتاج نہیں رہے۔

اب رہا میرٹھی صاحب کا راویانِ حدیث اور خصوصاً امام بخاری رحمہ اللہ کے خلاف قرآن کو یاد

نہ کرنے ، نہ سمجھنے اورغور وتدبر نہ کرنے کی بات کرنا تو اس بکواس نے خود انہی کو قیامت تک کے لیے رسوا کیا ہے ، کیونکہ قارئین حدیث نمبر ⑥ میں ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ میرٹھی صاحب نے قرآنِ کریم کے الفاظ لَوْ نَعْلَمُ کو عربیت کے لحاظ سے غلط کہہ کر اپنی عقبیٰ خراب کر لی تھی۔اب ملاحظہ فرمائیں کہ یہاں پر انہوں نے خود وہی لفظ لکھ دیئے ہیں کہ منافقین نے لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنَاكُمْ ہی کہا تھا!

میرٹھی صاحب کی ان دونوں متناقض عبارتوں میں (۷۳۔۸۵) صرف بارہ صفحات کا فاصلہ ہے۔اب ہر انصاف پسند قاری فیصلہ کرسکتا ہے کہ قرآن راویانِ حدیث اور امام بخاری رحمہ اللہ کو یاد نہ تھا یا اس بد دماغ، جاہل، بے وقوف اور بھلکڑ میرٹھی صاحب کو، جسے بارہ صفحات قبل لکھی ہوئی اپنی بے وقوفی بھی یاد نہیں رہ سکی؟ کسی کی پگڑی اچھالنا بہت آسان ہے اور اپنی پگڑی سنبھالنا بہت مشکل!

لعنت ہو ایسے اعتقاد پر، جو میرٹھی صاحب کی اتنی ''مٹی پلید'' ہونے کے باوجود قائم رہے!

② اس حدیث میں عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کا کوئی ذکر نہیں ۔میرٹھی صاحب نے اپنی طرف سے صحیح بخاری پر یہ جھوٹ باندھا ہے کہ اس میں ان کی بات ہو رہی ہے۔

صحیح بخاری میں صرف اتنا بیان ہے کہ کچھ منافقین جو جنگ کے لیے پہلے مسلمانوں کے ساتھ شامل ہوئے تھے، پھر مسلمان فوج سے جدا ہوئے گئے تھے اور ان کے بارے میں صحابہ کرام مختلف الخیال ہوئے تھے ۔صحیح بخاری کے علاوہ جن روایات میں اس آیتِ کریمہ کا مصداق عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کو ٹھہرایا گیا ہے، وہ یا تو بے سند ہیں یا ان میں ضعف وانقطاع ہے۔فتح الباری (۳۵٦/۷) میں اگرچہ حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ کا بھی رجحان اسی طرف ہے کہ یہاں عبداللہ بن اُبی اور اس کے ساتھی مراد ہیں،لیکن انہوں نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ عبداللہ ابن اُبی منافق اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں اس آیت کے نزول کا قصہ صحیح بخاری میں نہیں ، بلکہ اور کتب میں ہے۔یہی علمی دیانت کا تقاضا ہے،لہٰذا میرٹھی صاحب کا اسے صحیح بخاری کی

طرف منسوب کر کے اس پر اعتراضات کرنا ناانصافی اور ہٹ دھرمی کا شاخسانہ ہے، کوئی علمی کاوش نہیں ہے۔

③ ہجرت کا مطلب ہر جگہ اور ہر وقت مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے جانا نہیں ہوتا، بلکہ یہ ایک جامع لفظ ہے، خود رسول اللہ ﷺ نے فرمادیا ہے: **((والمهاجر من هجر ما نهى الله عنه))** ''اور مہاجر وہ ہے جو اللہ کی منع کردہ چیزوں کو چھوڑ دے۔''

(صحیح بخاری : ١٠، ٦٤٨٤)

لہٰذا اگر عبداللہ بن اُبی اور اس کے ساتھی بھی اس آیتِ کریمہ کے مصداق قرار دیئے جائیں تو کوئی اعتراض نہیں آتا، کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جب تک منافقین اللہ کے منع کردہ کام، یعنی نفاق کو اللہ کے رضا کے لیے چھوڑ نہ دیں، اس وقت تک ان سے دوستی نہ کرو، اگر وہ نفاق سے باز نہ آئیں تو پھر ان سے لڑائی کرو۔۔۔

④ اب میرٹھی صاحب کے وہ معتقدین، جن کے ذہن میں اب بھی ان کا کچھ اعتقاد باقی ہے، ان سے سوال ہے کہ صحیح بخاری کی اس اتفاقی طور پر صحیح حدیث کا انکار کر کے جو تفسیر میرٹھی صاحب نے خود کی ہے، اس کی کیا دلیل ہے؟ میرٹھی صاحب خود تو غزوۂ اُحد میں موجود نہ تھے۔ آخر کسی ذریعہ سے ان کو یہ بات پہنچی ہوگی کہ اس آیت میں ''نام نہاد مسلمانوں'' کا ذکر ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ صحیح بخاری و صحیح مسلم وغیرہما کی اس صحیح حدیث کے علاوہ جتنے بھی شانِ نزول اس آیتِ کریمہ کے ذکر کیے گئے ہیں، سب کے سب بے اصل اور سخت ضعیف ہیں، ان کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیں:

١۔ **حدیثِ زید بن ثابت** رضی اللہ عنہ (المعجم الکبیر للطبرانی : ١٢٠/٥، ح : ٤٨٠٥)

اس کی سند سخت ''ضعیف''، بلکہ موضوع ہے، کیونکہ اس میں جابر بن یزید الجعفی متروک راوی ہے، نیز جابر جعفی اور امام سفیان کی ''تدلیس'' بھی اس میں موجود ہے۔

٢۔ **حدیثِ عبدالرحمٰن بن عوف** رضی اللہ عنہ (مسند الامام احمد : ١/ ١٩٢)

علامہ ہیثمی رحمہ اللہ اس کے بارے میں لکھتے ہیں: **رواہ أحمد ، وفیہ ابن إسحاق ، وهو مدلّس ، وأبو سلمة لم يسمع من أبيه .** ''اسے امام احمد نے بیان کیا ہے ، اس میں محمد بن اسحاق ہیں اور وہ مدلس ہیں ، نیز ابوسلمہ نے اپنے والد سے سماع نہیں کیا۔'' (مجمع الزوائد : ٦٤/٧)

اور جس روایت پر اعتماد کر کے میرٹھی صاحب نے یہ تفسیر کی ہے، اس کا حال بھی ملاحظہ فرمائیں:

۳۔ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہما (تفسیر ابن ابی حاتم : ۱۰۲۳/۳، تفسیر الطبری : ۸ /۱۰)

اس کی سند مسلسل بالضعفاء ہے۔سند کا سلسلہ یوں ہے:

حدّثنی محمّد بن سعد ، قال : حدّثنی أبی (سعد بن محمّد) ، قال : حدّثنی عمّی (الحسین بن الحسن بن عطیّة) ، قال : حدّثنی أبی (الحسن بن عطیّة) ، عن أبیه (عطیّة بن سعد بن جنادة) ، عن ابن عبّاس ...

اب ترتیب وار اس سند کے سارے راویوں کے حالات ملاحظہ فرمائیں ، جس پر میرٹھی صاحب نے اعتماد کر کے صحیح بخاری کی اتفاقی طور پر صحیح حدیث کا انکار کیا ہے۔

۱۔ محمد بن سعد العوفی: اسے خطیب بغدادی رحمہ اللہ اس کے بارے میں فرماتے ہیں: **کان لیّنا فی الحدیث .** ''وہ حدیث میں کمزور تھا۔''(تاریخ بغداد للخطیب : ۳۲۲/۵)

۲۔ سعد بن محمد العوفی: امام احمد رحمہ اللہ اس کے بارے میں فرماتے ہیں:

ذاک جهمیّ .. لو لم یکن هذا أیضا لم یکن ممّن یستأهل أن یکتب عنه.(تاریخ بغداد للخطیب : ۱۲۶/۹، وسندہٗ حسنٌ ان شاء اللّٰہ)

۳۔ الحسین بن الحسن بن عطیہ العوفی: امام ابوحاتم رحمہ اللہ اس کے بارے میں فرماتے ہیں: **ضعیف الحدیث .** ''اس کی حدیث ضعیف ہوتی ہے۔''

(الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم : ۴۸/۳)

امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ نے اسے ''ضعیف'' قرار دیا ہے۔(الکامل لابن عدی : ۲ /۳۶۳)

امام ابنِ عدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وللحسين بن الحسن أحاديث عن أبيه عن الأعمش وعن أبيه وعن غيرهما وأشياء لا يتابع عليه .

''حسین بن حسن کی اپنے والد کے واسطے سے اعمش سے اور اپنے والد سے اور ان کے علاوہ سے احادیث اور کئی دوسرے منکر آثار ہیں، جن پر اس کی کوئی موافقت نہیں کرتا۔''

(الکامل فی ضعفاء الرجال لابن عدی : ۲/۳٦٤)

امام ابنِ سعد رحمہ اللہ لکھتے ہیں: سمع سماعا كثيرا ، وكان ضعيفا في الحديث ... ''اس نے (احادیث کا) بہت زیادہ سماع کیا تھا، لیکن حدیث میں ضعیف تھا۔''(الطبقات الکبریٰ لابن سعد : ۳۳۱/۷)

امام عقیلی رحمہ اللہ نے بھی اسے ''ضعیف'' راویوں میں شمار کیا ہے۔(الضعفاء لہٗ : ۱/۲۵۰)

امام ابنِ حبان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: منكر الحديث ... ولا يجوز الاحتجاج بخبره . ''یہ منکر الحدیث تھا۔۔۔اس کی حدیث سے حجت لینا جائز ہی نہیں۔''(المجروحین لابن حبان : ۲۲٦) علامہ ابن الجوزی رحمہ اللہ نے اسے ''ضعیف ومتروک'' راویوں میں شمار کیا ہے۔(کتاب الضعفاء والمتروکین لابن الجوزی : ۲۱۱/۱)

٤۔ الحسن بن عطیہ بن سعد: امام بخاری رحمہ اللہ اس کے بارے میں فرماتے ہیں: لیس بذاک۔ ''یہ اس (حدیث) کے قابل نہیں۔''(التاریخ الکبیر للبخاری : ۲٥٤۲) امام ابو حاتم رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ضعيف الحديث . ''اس کی حدیث ضعیف ہوتی ہے۔''(الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم : ۲٦/۳) امام ابنِ حبان رحمہ اللہ کا فرمان ہے : وأحاديث الحسن بن عطيّة ليست بنقيّة . ''حسن بن عطیہ کی احادیث صاف (صحیح) نہیں ہیں۔''(الثقات لابن حبان : ٦ /۱۷۰)

نیز لکھتے ہیں: منكر الحديث ... ووجب تركه . ''یہ منکر الحدیث راوی ہے

''۔۔۔اس (کی احادیث) کو چھوڑ دینا واجب ہو گیا ہے۔'' (المجروحين: ١/ ٢٣٤)

علامہ ابن الجوزی رحمہ اللہ نے اسے ''ضعیف ومتروک'' راویوں میں شمار کیا ہے۔

(كتاب الضعفاء والمتروكين لابن الجوزى: ١/ ٢٠٥)

٥۔ عطیہ بن سعد العوفی: جمہور کے نزدیک ''ضعیف'' ہے، نیز ''مدلس'' بھی ہے۔

حافظ نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **ضعيف عند الجمهور .** ''جمہور کے نزدیک یہ راوی ضعیف ہے۔'' (تهذيب الاسماء واللغات للنووى: ١/ ٤٨) حافظ عراقی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **ضعّفه الجمهور .** (طرح التثريب لابنه: ٣/ ٤٢) حافظ ہیثمی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: **والأكثر على تضعيفه .** (مجمع الزوائد: ١٠/ ٤١٢) حافظ ابن الملقن رحمہ اللہ اسے ''ضعیف'' قرار دے کر لکھتے ہیں: **والجمهور على تضعيفه .** ''جمہور اس کی تضعیف کرتے ہیں۔'' (البدر المنير لابن الملقن: ٧/ ٤٦٣) امام ہشیم بن بشیر اور امام سفیان ثوری رحمہما اللہ نے اسے ''ضعیف'' قرار دیا ہے۔ (الجرح والتعديل: ٦/ ٣٨٣)

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **ضعيف الحديث .** ''یہ ضعیف حدیث والا ہے۔'' امام ابوزرعہ الرازی نے اسے ''لیّن'' کہا ہے اور امام ابوحاتم الرازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

ضعيف الحديث ، يكتب حديثه . ''ضعیف الحدیث ہے، اس کی حدیث (متابعات وشواہد میں) لکھی جائے گی۔'' (الجرح والتعديل لابن ابى حاتم: ٦/ ٣٨٣)

امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اسے ''ضعیف'' قرار دیا ہے۔ (سنن الدارقطنى: ٤/ ٣٩)

نیز فرماتے ہیں کہ ''مضطرب الحدیث'' ہے۔ (العلل للدارقطنى: ٤/ ٢٩١)، امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **كان يحيىٰ يتكلّم فى عطيّة .** ''امام یحییٰ عطیہ پر کلام (جرح) کرتے تھے۔'' (التاريخ الكبير للامام البخارى: ٤/ ٨٣) نیز فرماتے ہیں: **كان يحيىٰ لا يروى عن عطية .** ''امام یحییٰ عطیہ بن سعد العوفی سے روایت نہیں کرتے تھے۔'' (التاريخ الكبير للامام البخارى: ٥/ ١٢٢)، امام یحییٰ بن معین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: **ضعيف ،**

الّا أنـه يكتب حديثه . ''یہ راوی ضعیف ہے، البتہ اس کی روایت (متابعات وشواہد) میں لکھی جائے گی۔'' (الکامل لابن عدی : ۳٦۹/۵ ، وسندہٗ حسن) امام نسائی رحمہ اللہ نے ''ضعیف'' کہا ہے۔ (میزان الاعتدال : ۳ /۸۰) امام ابنِ عدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: وهو مع ضعفه يكتب حديثه . ''ضعیف ہونے کے باوجود اس کی حدیث (متابعات وشواہد) میں لکھی جائے گی۔'' (الکامل فی ضعفاء الرجال لابن عدی : ۳۷۰/۵) امام ساجی رحمہ اللہ کہتے ہیں: ليس بحجّة . ''قابل حجت نہیں ہے۔'' (تہذیب التہذیب : ۲۰۲/۷) حافظ ابنِ حزم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: ضعيف جدّا . ''سخت ضعیف ہے۔'' (المحلی لابن حزم : ۸٦/۱۱)

حافظ نووی رحمہ اللہ نے بھی ''ضعیف'' کہا ہے۔ (خلاصۃ الاحکام للنووی : ۱ /۵۷۲)

حافظ ابنِ حجر رحمہ اللہ اس کے بارے میں لکھتے ہیں: ضعيف الحديث ، مشهور بالتّدليس القبيح . ''یہ راوی ضعیف الحدیث اور بری تدلیس کے ساتھ مشہور ہے۔'' (طبقات المدلسین لابن حجر : ۵۰) حافظ ذہبی رحمہ اللہ نے اسے ''ضعیف'' لکھا ہے۔ (میزان الاعتدال للذہبی : ۳ /۸۰) حافظ ابنِ کثیر رحمہ اللہ بھی ''ضعیف'' قرار دیتے ہیں۔ (تفسیر ابن کثیر : ٦ /۸۹)

لہٰذا امام عجلی، امام ابنِ سعد اور امام ترمذی رحمہم اللہ کا اسے ''ثقہ'' کہنا جمہور کے خلاف ہونے کی وجہ سے قابل قبول نہیں ہے۔

اب قارئین کرام ہی فیصلہ فرمائیں کہ عدی بن ثابت جیسے ثقہ راوی پر میرٹھی صاحب کا جرح کرنا، جس کو کسی ایک محدث نے بھی ''ضعیف'' قرار نہیں دیا تھا، لیکن دوسری طرف اس طرح کے راوی پر اعتماد کرنا، جسے درجنوں محدثین نے واضح طور پر ''ضعیف'' قرار دیا ہے! یہ کہاں کا انصاف ہے؟ اب قارئین ہی بتائیں کہ اس میں قصور صحیح بخاری کا ہے یا میرٹھی صاحب کی ''سمجھ داری'' کا؟

❁❁❁❁❁❁❁